قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام والامام محمد قاسم النانوتوی

بانی دارالعلوم دیوبند

اور اکابر امت کے علوم و افکار کا نقیب

ماہنامہ

ندائے دارالعلوم وقف دیوبند

NIDA-E-DARUL-ULOOM WAQF
DEOBAND

مدیر اعلیٰ

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب دامت برکاتہم

دفتر ماہنامہ

ندائے دارالعلوم وقف دیوبند

ضلع سہارنپور، یوپی (انڈیا)

قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام والامام محمد قاسم النانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

اور اکابر امت کے علوم وافکار کا نقیب

ماہنامہ ندائے دارالعلوم وقف دیوبند

جلد نمبر ۱۵ شوال المکرّم / ذی قعدہ ۱۴۴۵ھ مطابق اپریل / مئی ۲۰۲۴ء شمارہ نمبر ۱۱

مدیر اعلیٰ

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

مدیر

مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی

نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند

شرح خریداری

فی شمارہ	۲۵/روپے
سالانہ علاوہ ڈاک خرچ	۲۵۰/روپے
سالانہ مع ڈاک خرچ	۳۲۵/روپے
تاعمر	۵۰۰۰/روپے

◯ اس دائرہ میں سرخ نشان علامت ہے آپ کی مدتِ خریداری مکمل ہوچکی، رسالہ جاری رکھنے کے لئے دفتر سے رابطہ کریں۔

شائع کردہ : شعبۂ نشر واشاعت، دارالعلوم وقف دیوبند، سہارنپور (یوپی)

MONTHLY NIDA-E-DARUL ULOOM WAQF DEOBAND

SAHARANPUR (U.P.) INDIA PIN : 247554

Website: www.dud.edu.in / Email : nidaedarululoom@gmail.com

☆ مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ قانونی چارہ جوئی کا حق صرف مقامی عدالت کو ہوگا۔

اس شمارے میں

اداریہ

مقام غور وفکر	حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب	۳

بحث و تحقیق

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ.....	مولانا غلام نبی قاسمیؒ	۸

مقالات و مضامین

محبت رسول ﷺ کی چند بنیادی وجوہات	مولانا محمد الیاس گھمن	۱۱
طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے...	مولانا عتیق احمد بستوی	۱۴
مساجد میں خواتین کے آنے کے شرعی احکام	مولانا امانت علی قاسمی	۱۸
دورِ غلبہ واقتدار میں اہل کفر کی نفسیات	مولانا رفاقت حسین قاسمی	۲۳
خاندان ٹوٹنے کے عمومی اسباب...	مولانا محمد اسامہ صدیقی نانوتوی	۲۷
الحاد اور ارتداد کی جانب بڑھتا ہوا قدم	مولانا محمد اسجد عقابی	۳۶
بیع المعدوم کا تجزیاتی مطالعہ	مولانا عصمت اللہ نظامانی	۳۸
حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتویؒ	مولانا محمد معاذ لاہوری	۴۳
علمائے کرام اور سائنسدانوں کی ذمہ داریاں...	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۴۵
غیبت ایک لذیذ گناہ	مولانا عبد المتین	۵۳
صلاۃ التسبیح صغریٰ	مولانا محمد طیب حنیف	۵۶
علم کلام جدید	حکیم فخر الاسلام	۶۰

خبر نامہ

احوال وکوائف	ادارہ	۶۲

ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم'' دارالعلوم وقف کی ویب سائٹ پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ **Website: www.dud.edu.in**

نوٹ : خریدار حضرات رسالہ سے متعلق ضروری معلومات کے لئے اوقاتِ دفتر ۸ تا ۲ ربجے ہی رابطہ کریں۔ +91 8439512767, +91 8439412767

اداریہ

مقام غور وفکر

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب مدظلہٗ ❖

ماہ رواں (مئی ۲۰۲۴ء) کی پہلی اور دوسری تاریخ کو جامعہ ہمدرد نئی دہلی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں Centre for Research on Madarsa Education کے زیر اہتمام دو روزہ انٹرنیشنل سیمینار اور ورک شاپ کا انعقاد ہوا جس کے موضوعی عناصر کو ''مدارس میں دینی وعصری تعلیم کا امتزاج، امکانات اور چیلنجز'' سے تشکیل دیا گیا تھا، جس کو ملک کی سنجیدہ وراست فکر مؤقر تعلیمی شخصیات کی دلچسپی وشرکت نے مزید باوقار بنانے میں ایک اہم اور مؤثر کردار ادا کیا اور درپیش موضوع کے تعلق سے مختلف فکری زاویے، آراء ونظریات سامنے آئے۔

اپنے موضوع ''مدارس میں دینی وعصری تعلیم کا امتزاج، امکانات اور چیلنجز'' کی اساس پر منعقد ہونے والے اس سیمینار کی ناگزیر اہمیت اور گزرتے وقت کے ساتھ روز افزوں ضرورت اب بلاشبہ سنجیدہ غور وفکر سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے مدارس میں ایک ایسے قابل عمل متوازی نظام تعلیم جدید کی امتزاجی شمولیت کی متقاضی ہے جو ایک طرف عہد حاضر کے مطالبات اور اس کے منطقی تقاضوں کا احاطہ کر سکے تو دوسری طرف مدارس کے اپنے نظام تعلیم وتربیت کی مقصدی اہمیت ومعنویت بھی متأثر نہ ہونے دے، سن ۲۰۱۴ء کے بعد حکومت وقت نے مدارس میں عصری علوم کی لازمی شمولیت واضافات کی بنیاد پر اس موضوع کا مختلف ناحیۂ فکر سے جائزہ لے کر اس کو ملک کی ارتقائی پالیسیوں کا حصہ بناتے ہوئے مدارس سے فارغ شدہ طلبہ کے لیے قومی دھارے میں ضروری حصہ داری کی بات کہہ کر اس موضوع کی اندیشہ وشبہات میں محصور اہمیت اور ناگزیریت کو دوچند کر دیا تاکہ حکومتی نقطۂ نظر سے آج کی برق رفتار ترقیات میں مدارس کے تعلیمی کردار کی فعالیت کو مزاج عصر سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نئی جہات سے متعارف کرایا جا سکے، میں سمجھتا

❖ مہتمم دار العلوم وقف دیوبند
مدیر اعلیٰ ماہنامہ ندائے دار العلوم وقف دیوبند

ہوں کہ بعد از خرابیٔ بسیار اس کے اجباری نفاذ کے مرحلے سے قبل دیر ہونے کے باوجود ابھی بھی کسی نہ کسی درجے میں وقت اور موقع ہے کہ مدارس اپنے داخلی نظام اور مروج نصاب کو اضطرابی کیفیات سے دوچار کیئے بغیر اپنے ہی نظامِ عمل کے زیر اثر لازمی عصری علوم کی امتزاجی شمولیت کے تعلق سے قابلِ عمل راہوں کی تلاش وتنفیذ کو نسبتاً آسان بنا سکتے ہیں، اگرچہ فکر وعمل کے اس زاویہ کے زیر اثر آزاد حیثیت سے مختلف سطح پر کیئے جانے والے تجربات کے خوش آئند نتائج اور اس حوالے سے کی جانے والی جہود ومساعی کی مثبت نتیجہ خیزی کے محدود وعلاقائی اثرات کے ترتب سے کسی درجے میں بھی بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ملک کے موجودہ احوال میں درپیش مسائل ومطالبات کے وسیع تر منظرنامے کو مدنظر رکھتے ہوئے اعتدالِ فکر ونظر کے ساتھ لازمی عصری موضوعات پر مشتمل ایک ایسے متوازن عصری نظامِ تعلیم کو متعارف کرانے کی ضرورت ہے جس کی امتزاجی شمولیت وافادیت جہاں ایک طرف عصرِ رواں کے مطالبات کی تکمیلی صلاحیت کی حامل ہو تو دوسری طرف مدارس کی مقصدی معنویت پر کسی بھی درجے میں اثر انداز نہ ہوتی ہو، گذشتہ چند دہائیوں سے لے کر عہدِ رواں تک اس تعلق سے کی جانے والی اب تک کی کوششوں، کاوشوں اور تجربات کی روشنی میں عام مشاہدہ افراط وتفریط کی شدت پسندانہ اساس پر بایں طور طبقاتی تقسیم کی صورت میں سامنے آتا ہے کہ منقسم طبقات اپنے اپنے مستدلات پر اس درجہ پُر یقین انداز میں مُصر ہیں کہ مقابل رائے کو سننے سے قبل ہی مسترد کرتے ہوئے فکر ونظر میں کسی قسم کی لچک پیدا کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتے تھے، اس میں ایک طبقہ وہ ہے جو کہ مدارس کے فکر ومزاج، وسائل ومسائل، نفسیات وجذبات اور قرار واقعی فکری خصوصیات کے ترکیبی عناصر سے قطعاً نابلد ونا آشنا ہونے کے باوجود مدارس میں جدید نظامِ تعلیم کے جزوی اور ضروری امتزاج سے آگے قدم بڑھا کر جدید تعلیم کے نظام کی تنفیذ کو اصلِ کُل کی حیثیت سے مدارس کے نصاب ونظام میں شامل وداخل کرنے کی پُرجوش نمائندگی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی براہ راست ضرب مدارس میں مروج نصاب ونظام پر اس طرح پڑتی ہے کہ اس کی معنویت، مقصدیت، افادیت اور تاریخی حیثیت اس جدید نظام کی تابع مہمل بن کے صفر ہو جاتی ہے ظاہر ہے فکر ونظر کا یہ انتہاء پسندانہ زاویہ اربابِ مدارس کے نزدیک کسی بھی صورت میں محلِ غور قرار پانا تو دور کی بات ہے لائقِ اعتنا بھی بننے سے قاصر ہے، جبکہ اس کے عین مقابل ایک دوسرا زاویۂ فکر ہے جو اصولِ اعتدال اور تقاضائے وقت کی مسلمہ حیثیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے قدیم تعلیمی روایات کو تحفظ فراہم کیے جانے کے نقطۂ نظر سے کسی بھی نوعیت سے جدید خارجی امتزاجات کے نتائج کو مدارس کے نصاب ونظام میں مضرت خیز خدشات کی صورت میں دیکھتا ہے اور ان کا قدامت پسندانہ علم وفکر مدارس کے نصاب ونظام میں عہدِ رواں کی ہمہ جہت مصالح

اور گذرتے وقت کی نزاکتوں کو درگذر کرتے ہوئے جزوی امتزاجی تبدیلی کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتا ہے، گویا کہ دونوں طبقات کے نمائندہ حضرات اپنے اپنے دلائل ونظریات کے تناظر میں بالکل متضاد انتہاؤں پر قائم نظر آتے ہیں اور یہ فکری کشاکش کسی متوازن نہج پر حلِّ مسئلہ میں سدراہ ثابت ہوتی ہے، اس سمت میں کی جانے والی اب تک کی اکثر وبیشتر پیش رفت کا آخری نتیجہ سرگرم بحث ومباحثے کے بعد ایک طویل خاموشی کی صورت میں ہی برآمد ہوتا دیکھا گیا ہے، جس کو عصر رواں کی اصطلاح میں کسی کام کو ''ٹھنڈے بستے'' میں ڈالنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ اختلاف رائے کی گنجائش کے ساتھ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بہر دو جانب سے اس نوعیت کی غیر معتدل صورت حال کے رہتے کسی وسیع تر افادیت اور نتیجہ خیزی تک رسائی اگرچہ ناممکن تو نہیں لیکن بُعد المشرقین آراء میں قربت فکر کے امکانات کو تلاش کرنا کم از کم ایک انتہائی دشوار گزار مرحلہ ضرور ہے اور حقیقت کا یہ پہلو بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس قسم کے دوطرفہ غیر معتدل نظریات کے درمیان سے متوازن اور قابل عمل امکانات کی بازیافت کو نتیجہ خیز بنانا دونوں طبقات کی باہم دگر فکری معاونت کے بغیر ممکن نظر نہیں آتا ہے۔

موضوعی نقطۂ نظر سے اس نوع کے مذاکرات میں اس حقیقت کا پیش نظر ہونا بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ مدارس کے نصاب ونظام میں بہ قاضائے وقت جدید موضوعات کی شمولیت کا یہ فکری موضوع آج کوئی نیا نہیں ہے بلکہ دارالعلوم دیوبند کے دور بناء کی سمت اگر ہم لوٹتے ہیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ کے مرتب کردہ نصاب تعلیم میں اُس دور کے جدید موضوعات کی نمائندگی واضح انداز میں پائی جاتی ہے جو ان کی مستقبل بین بصیرت اور فکر ونظر میں اعتدال ووسعت کی غمازی کے ساتھ بہ تقاضائے وقت متوازن انداز میں جدید موضوعات کی شمولیت کی ناگزیر اہمیت کو تسلیم کئے جانے کے لیے دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں مرتب کردہ نصاب تعلیم میں علوم اسلامی تفسیر قرآن، علم حدیث، اصول فقہ کے ساتھ مرحلہ بہ مرحلہ اپنی مکمل اہمیت کے ساتھ ریاضی ہندسہ اور علم ہیئت کی بڑی واضح نمائندگی فکر نانوتوی کی اُس دوررس نتائج کی حامل ژرف نگہی کی عکاس ہے جس کے اجباری نفاذ کے خدشات سے مدارس کو آج سامنا ہے، بہ تقاضائے وقت علوم عصریہ کی امتزاجی شمولیت کا یہ تسلسل مابعد کے تاریخی حیثیت کے حامل ادوار میں بھی حسب موقع ومحل مفید مطلب خارجی تعلیمی عناصر کی جزوی شمولیت کی صورت میں سلسلہ وار انداز میں ملتا ہے چنانچہ اس تعلق سے جہاں ایک طرف دارالعلوم دیوبند میں جامعۂ طبیہ (Medical College) کا تاریخ ساز قیام اور اس کے ثمر آور مثبت نتائج کو آج بھی تاریخی نوعیت سے ملت اسلامیہ کے سنجیدہ اور

راست فکر طبقات میں ایک اہم ترین سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، وہیں دوسری جانب اس قدیم دور میں جب کہ فنی تعلیم (Skill Education) کا منضبط انداز میں تصور عام نہیں تھا اس وقت میں وسعت فکر ونظر کے حامل ارباب دارالعلوم دیوبند نے فنی تعلیم کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے دارالصنائع (Hand Craft) کا شعبہ قائم کیا جس میں تعلیمی نظام الاوقات کے علاوہ خارج میں سوٹ کیس سازی اور کپڑا اسلائی جیسے ہنر خواہش مند طلبا کو اس لیے سکھائے جاتے تھے تاکہ کارگاہ عمل میں اپنی اہم مقصدی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے درمیان حسب موقع کسب حلال کی تلاش میں کسی کے دست نگر نہ رہیں جبکہ ۲۰۱۴ء کے بعد حکومت کی جانب سے Education IT کی حوصلہ افزائی کے پس پردہ بھی فراہمیٔ روزگار کے حوالے سے اسی نوعیت کے عوامل کارفرما ہیں، گویا حکومتی حلقوں کے اصحاب حل وعقد جس مقام پر پہونچ کر آج کے مواقع کی بات کررہے ہیں ہمارے باشعور اکابر آج سے دہائیوں سال قبل اس حقیقت کی رمز شناسی کا ادراک کرکے اس کی عملی شکل کو متعارف کراچکے تھے کیونکہ دورِ قدیم میں اس نوعیت کے ہنر وفنون پسماندہ دیہات وطبقات میں روزگار کی سہولت فراہم کیے جانے میں معاون ثابت ہوتے تھے جو گذرتے وقت کی تبدیلیوں کے زیر اثر مقصدی یگانگت کے ساتھ آج موبائل اور دوسری الیکٹرونکس کی فنی تعلیم سے مبدل ہوگئے ہیں، حاصل کلام یہ ہے کہ مدارس میں علوم عصریہ کی امتزاجی شمولیت خواہ اس کی نوعیت فنی ہو کہ علمی ہو اس کا نصاب ونظام مدارس میں مقصدی نصب العین سے مغائرت نہیں پائی جاتی ہے بلکہ قدیم دور کے ہمارے اکابر کی فکری وسعت اور مستقبل شناس فراست کے زیر اثر اس نوع کے اقدامات ہمارے لیے مہمیز و مثال کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے وقت کے رہتے بالاتر قوتوں کے بالاجبار تنفیذی احکام سے قبل کیوں نہ اس سمت میں مثبت اقدامات پر سنجیدہ غور وفکر کرلیا جائے، تحدیث نعمت کے طور پر اتنی بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ رب کریم کی سایہ فگن رضائے حق اور عطائے توفیق کے صدقے میں موجودہ عہد میں وقت کے تقاضوں، مطلوب مطالبات کی حساسیت اور اس کی قرار واقعی افادیت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر شعوری ادراک واقدامات کو فکری وعملی بہر دو سطح پر دارالعلوم وقف دیوبند میں بحمد اللہ آج بھی موضوعی حیثیت حاصل ہے جس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ادارہ بہ تقضائے وقت درپیش مسائل کے تعلق سے ممکن حد تک سنجیدہ ومتوازن حل ونفاذ کی راہ پر گامزن و پُر عزم رہتا ہے، اسی سلسلۂ کلام کے ذیل میں بانداز دگر برسبیل تذکرہ یہ گوشۂ فکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے منسوب ایک بڑا مشہور عام قول ہے، ''العلم علمان علم الادیان و علم الابدان''، اس کے جزو اول علم الادیان کے ضمن میں بشمول تعلیمات اسلام دنیا میں پائے جانے والے ہر ایک مذہب سے تعلق رکھنے والی ہمہ نوع رسوم و روایات

آجاتی ہیں جبکہ جز وثانی علم الابدان کا تعلق ہر قسم کی مادیات کے علم وآگہی اور معرفت وآشنائی سے مربوط ہے جس سے انسان کی حیات دنیوی کی ہر قسم کی تمام ضروریات وابستہ ہیں، اگر دین حق کے زاویہ سے دیکھا جائے تو ذات حق جل مجدہ کے نازل کردہ بہر دو اقسام علم کا تعلق حقیقتاً شریعت اسلامی کی وسعت وتعمق سے ہی ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرق مفہوم کے ساتھ یہ ایک ہی وحدت کے بایں طور دو رُخ ہیں کہ ادیان کا علم مقصود ہے اور ابدان یعنی مادیات کا علم وسیلہ ہے۔ جس کو مزید وضاحت کے طور پر تمثیلاً کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہر ایک آغاز کو اپنے انجام سے نسبت ہوتی ہے اسی طرح وسائل ومقصود کے مابین بھی ایک خاص نوعیت کی مناسبت اور علاقہ کا رشتہ پایا جاتا ہے، لہٰذا مقصدی حیثیت سے بہر دو اجزائے علم کا تجزیہ کیا جائے تو حاصل مطلوب معرفت حق کی صورت میں نمایاں ہوگی کیوں کہ علم کے رأس المال کو اصحاب علم نے خدا شناسی کے مفہوم سے تعبیر کیا ہے خواہ اس کا تعلق حق تعالی کی ذات سے ہو کہ صفات سے ہو اور اس پر مستزاد یہ دین اسلام کا اختصاصی پہلو ہے کہ فرق نیت سے وسیلہ بھی مقصود بن سکتا ہے اور زاویۂ فکر ونظر میں ارادہ ونیت کا معمولی سا تفاوت مقصود کو وسیلے سے مبدل کردینے کے لیے کافی ہے البتہ بہر دو اقسام علم میں قدرِ مشترک کا پہلو یہ ہے کہ جو علم حق کا راستہ دکھانے سے قاصر ہو وہ فی الحقیقت جہالت ہے اس کو صورت علم کا عنوان تو دیا جاسکتا ہے مگر اس کو حقیقت علم کے زمرے نہیں رکھا جاسکتا ہے چنانچہ ثابت ہوا کہ جس طرح علم مقصود کی مسلمہ حیثیت ناقابل تردید ہے اسی طرح مادیات سے مشکّل اس کون ومکاں میں وسائل کی ثابت شدہ خصوصیات، اہمیت وضرورت اور احتیاج سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا علم ومعرفت کی معنوی حقیقت کے تناظر میں اگر وسائل کی حیثیت سے علم الابدان کی وسیع ترین اہمیت اور ضرورت پر غور کیا جائے تو حل مسئلہ کے تعلق سے ذہن سے گمشدہ پہلو نمایاں ہوکر فکری معاونت کی راہ کو ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں، اس موضوع کی ہمہ گیری اس قدر وسیع تر ہے کہ اس کے تناظر میں زیر نظر تحریر کو محض تعارف اجزاء سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

وماعلینا إلا البلاغ المبین

بحث و تحقیق

قسط نمبر:۷۷

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

کے علوم وافکار کی تشریح وترجمانی ''تقریر دلپذیر'' کی روشنی میں

مولانا غلام نبی قاسمیؒ ❖

اہل علم جانتے ہیں کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی دینی بصیرت اور فرق ضالہ باطلہ کی تردید میں مضبوط عقلی دلائل آپ کا ایک ایسا امتیاز ہے کہ جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کے حصہ میں آیا، حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند نے بتوفیق ایزدی حضرت نانوتویؒ کی جملہ تصانیف کی تشریح وتسہیل کا عزم کیا ہے۔

افادۂ قارئین کے لیے آغاز حضرت قدس سرہٗ کی مشہور تصنیف ''**تقریر دلپذیر**'' سے کیا جارہا ہے، امید ہے کہ یہ سلسلہ اہل علم کو پسند آئے گا۔

محمد شکیب قاسمی
ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی

ہاں اگر حرکات کو متصل نہ مانیے، تو البتہ اس بات کے کہنے کی گنجائش ہے کہ حرکتِ بطی یعنی دھیمی حرکت میں سکونات رلی ملی ہوئی ہیں۔ مگر درصورتِ اتصال وتساویٔ وقت یہ تفاوتِ مسافت بجز اس کے متصور نہیں، کہ جیسے اس زاویے کے اوتارِ مترتبہ- جو مرکز کرۂ متحرک ساکن المرکز پر بنا ہوا ہو، بہ سبب اوپر تلے ہونے کے- متفاوت المقدار ہوتے ہیں اور اس پر اگر زاویہ کو بعدِ مجرد میں تصور کر کے اوتار کو کرۂ متحرکہ میں فرض کریں، تو بہ وجہ سکون بُعد، زاویہ تو ساکن رہے گا۔ پھر اوتار بہ وجہ حرکت کرۂ باوجود تفاوتِ مقادیر، ایک ساتھ زاویۂ مذکورہ کے مقابل آئیں گے۔ اور ایک ساتھ نکل جائیں گے، ایسے ہی قطعاتِ زمانہ مختلف المقدار ایک ساتھ آئیں اور ایک ساتھ گذر جائیں۔ اس صورت میں یہ معینہ حرکت۔ جو اجزائے زمانہ میں ذاتی ہے۔ باوجود تفاوتِ مسافات، حرکاتِ زمانہ کے مقدار ہونے میں خلل انداز نہ ہوگی۔

مگر یہ ہے، تو جیسے زاویہ میں جانبِ راس محدود ومتناہی ہوتی ہے اور پھر اس پر بہ خیال کشش ساقین الی غیر النہایت وتر کی بھی لا تناہی متصور ہے، ایسے ہی اس حرکت کو خیال کیجئے جو زاویۂ مذکورہ پر منطبق ہو۔

علی ہذا القیاس وہ زمانہ- جو حرکتِ منطبقہ علی الزاویہ پر منطبق ہو ایک جانب سے محدود ومتناہی اور

❖ سابق استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

محصور ہوگا۔ اور ایک جانب سے غیر محصور اور غیر محدود اور غیر متناہی ہوگا اور وہ اعتراض لازم نہ آئے گا کہ زمانۂ متناہی میں مسافتِ غیر متناہیہ منقطع ہوگئی۔

الغرض، حرکتِ غیر متناہیہ اور مسافتِ غیر متناہیہ کے لئے صورتِ مفروضہ دلیلِ ابطالِ لاتناہی میں (بھی) زمانۂ غیر متناہی کام آیا ہے، مگر چوں کہ ہم جانبِ تناہی میں واقع ہیں اور یہ جانب متناہی اور وہ جانب غیر متناہی مثل وتر آخر زاویہ غیر متناہی السا قین اور اوتارِ باقیہ باہم منطبق اور ایک ساتھ آتے جاتے ہیں۔ اس لئے اس لاتناہی کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔

اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کو، یا اکثر اشخاص کو زمانۂ قلیل محسوس ہو اور کوئی شخص خاص اس زمانۂ محدود میں وہ کام کرے جو اوروں سے برسوں اور مہینوں میں نہ ہوسکیں۔ اور یہ عقیدہ اہلِ اسلام کا کہ ''ہمارے پیغمبر جناب محمد عربی ﷺ'' شبِ معراج میں تمام افلاک کی سیر کرآئے اور پھر وہ اتنا لمبا چوڑا قصہ ہے کہ چند روز وشب؛ بلکہ ہفتوں؛ بلکہ مہینوں؛ بلکہ برسوں پھیلایئے تو پھیلے- بایں خیال کہ اتنی دیر میں اتنے کاموں کا کرلینا محال ہے- غلط نہ ہو۔ علی ہذا القیاس اور ایسے ایسے افسانے ہر قوم کے بزرگوں کے بہ شرط صحتِ روایت بہ وجہ قلتِ زمانہ وکثرتِ وقائع، غلط نہیں ہوسکتے۔

القصہ، بطلانِ لاتناہیٔ بُعدِ مجرد پر کوئی دلیل قاطع قائم نہیں، فقط مغالطات ہیں، جو بادی النظر میں مبطلِ لاتناہی معلوم ہوتے ہیں اور ہر تناہی کے لئے ضرورتِ لاتناہی کی ثابت ہوجانا- جیسا کہ تقریر گذشتہ اس پر شاہد ہے- لاتناہیٔ بُعدِ مجرد کے لئے مؤید ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں تناہیٔ ابعادِ اجسامِ متناہیہ کی بھی لاتناہی مخرج اور مقسم ہوگی۔ پھر اس سے ہم کو کیا ضرورت ہے کہ لاتناہیٔ بعد کو باطل سمجھیں؟ اور اس کے بطلان کے باعث بایں خیال- کہ تناہی کی صورت میں اور دشواریاں بزعمِ خود پیش آتی ہیں- وجودِ بعد ہی سے انکار کر بیٹھیں۔ اگر فہمِ خداداد ہو، تو ظاہر ہے کہ نہ لاتناہی میں کوئی خرابی ہے- چناں چہ بہ تفصیل معلوم ہوگیا۔ اور نہ تناہی میں کوئی دشواری۔ اور نہ قطع نظر تناہی اور لاتناہی کے خود وجودِ بعد میں کوئی دقت۔

تناہی کی صورت میں دشواری تھی، تو یہ تھی کہ بُعدِ مجرد ہو، یا بعدِ مادی ہو، بعد کا دونوں پر اطلاق ہونا اس بات پر گواہ ہے کہ حقیقتِ بعد دونوں جا مشترک اور واحد ہے۔ ادھر تناہی کو کوئی نہ کوئی شکل لازم۔ اس صورت میں جون سی شکل، بُعدِ مجرد کی ہوگی، لازم یوں تھا کہ ابعادِ مادی بھی سب کے سب اسی شکل پر ہوتے، اور یہ اختلافِ اشکال اور تعدد صور ہرگز ظہور میں نہ آتا۔ مگر یہ دقّت جبھی تک ہے، جب تک یہ بات مان رکھی ہے کہ اشکال سب کی سب طبعی ہوتی ہیں۔ اور اگر یوں کہیے کہ اجسامِ ''اشکالِ طبعی اول تو طبعی نہیں اور اگر طبعی ہیں بھی، تو بہ نسبت مادۂ اجسام، طبعی ہیں، بہ نسبت ابعادِ اجسام طبعی نہیں، غیر طبعی ہیں۔ یا شکل بعدِ مجرد

ہے۔ جو کچھ ہو غیر طبعی ہو، تو پھر یہ دشواری، تناہیٔ بعدِ مجرد سے کوسوں دور تشریف لے جائے گی۔

رہی وہ دقّت، جو قطع نظر تناہی اور لاتناہی کے وجودِ بعد ہی سے متعلق ہے، وہی لزوم تداخلِ ابعاد تھا، جو بہ خیالِ اثنینیتِ بعدِ مجرد و بعدِ اجسام نظر آتا ہے۔ مگر حسب معروضِ احقر جب اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ جیسا باوجود تعدّد و اثنینیتِ کشتی و جالسانِ کشتی، حرکتِ کشتی و جالسانِ کشتی ایک ہے، ایسے ہی۔ باوجود تعدّد و اثنینیتِ اجسام و بعدِ مجرد۔ ایک ہی ہے تو پھر یہ خرابی کبھی موجب تردد نہیں رہتی۔ (۱)

پھر کیا ضرورت ہے کہ مکان، بعدِ مجرد کو تو نہ کہیں، کہیں تو اور اجسام کی سطح محیط کو کہیں، جس میں کثرت سے دشواریاں پیش آئیں اور ایک سے بھی نجات نہ ہو۔

اگر حسبِ قراردادِ بعض حکمائے یونان اپنا مکان ہوا کے اس سطح کو کہیں جو ہم کو محیط اور ہم سے متصل ہے، تو اول تو اس صورت میں سب سے اوپر کے آسمان کے لئے کوئی مکان نہ ہوگا، لامکان ہوگا جس سے یہ لازم آتا ہے کہ کسی جسم کو بھی بہ لحاظِ جسمیت، مکان کی حاجت نہیں اور جب لحاظ جسمیت، مستدعیٔ مکانیت نہیں، تو اور کوئی لحاظ کا ہے کو مستدعی اور مقتضیٔ جسمیت ہوگا۔ کیوں کہ اجسام کا ذو بعد ہونا ہی اس بات کو مقتضی تھا۔ وہ نہ ہو، تو اجسام بھی مثل عقول و نفوس لامکانی ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ ابعادِ اجسام کو جسمیت سے تعلق ہے اور کسی چیز سے تعلق نہیں۔ کیوں کہ جسم نام ہے اس کا جو قابلِ ابعاد ہو، خاص کر حکمائے مذکورین کے نزدیک۔ اور یہ بات ایسی ہے کہ کوئی صاحب وجدان۔ میں جانتا ہوں۔ تسلیم نہیں کر سکتا۔

دوسرے یہ دقت ہے کہ اجسامِ متحرکہ بالبداہت بجمیع اجزائہا متحرک ہوتے ہیں اور حرکتِ مکانی میں بھی ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف انتقال ہوا کرتا ہے۔ مگر مکان سطحِ مذکور کو کہیے، تو لازم آتا ہے کہ اجزائے اجسام متحرک نہ ہوا کریں۔ اور یہ بات بھی ایسی ہے کہ اس کو کوئی صاحبِ عقل نہیں تسلیم کر سکتا۔

❁......❁......❁

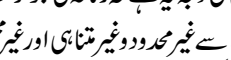

(۱) زمانہ تتابع تعلقات ارادۂ ازلی کو کہتے ہیں (یعنی ارادہ ازل میں پے در پے مراد سے متعلق ہوتا رہے) جیسے ہر مصدر کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک مبنی للفاعل دوسرا مبنی للمفعول۔ اسی طرح ارادہ میں بھی یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ارادہ میں جو حرکت ہوتی ہے اگر وہ صرف فاعل ہی تک محدود رہے تو ارادہ ازلی کی یہ کیفیت، منجملہ صفاتِ خداوندی ہوگی۔ اور اگر ارادہ مبنی للمفعول ہو تو پھر ارادہ کی یہ کیفیت احوال مخلوقات میں ہوگا اور یہی حقیقت زمانہ ہے۔ حکماء کے نزدیک اجسام، حرکات اور زمانہ سب کے سب متصل واحد ہیں نہ اجسام میں اجزاء نہ حرکات میں اقتران، نہ زمانہ میں آنات (آن کی جمع، ایک لمحہ) اور اگر حرکات کو متصل نہ مانیں تو پھر حرکت سریعہ اور حرکتِ بطیئہ کی تقسیم کی گنجائش نکلتی ہے جیسے آنحضرت ﷺ کے سفر معراج کی رفتار اتنی سریع تھی کہ جو معمول کی رفتار کے ایک طویل عرصہ کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ کی جو حرکتِ منطبقہ، زاویہ پر منطبق ہو، وہ ایک جانب سے محدود و متناہی اور محصور ہوتی ہے اور دوسری جانب سے غیر محدود و غیر متناہی اور غیر محصور ہوتی ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ زمانہ متناہی میں مسافت غیر متناہیہ کا طے کر لینا کیسے ممکن ہے؟ جیسا کہ واقعۂ معراج میں ہوا۔ فافهم۔

مقالات و مضامین

محبتِ رسول ﷺ کی چار بنیادی وجوہات

مولانا محمد الیاس گھمن ❖

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام) قرآن کریم (میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کا حقیقی مقصد آپ کی تعلیمات پر دل و جان سے عمل کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات واجب الاطاعت ہے، اسی اطاعت رسول میں دنیوی واخروی نجات مضمر ہے، اسی میں خدائے لم یزل کی رضا موجود ہے اوراسی پر انعام الٰہی کا وعدہ ہے۔

رسول چونکہ وحی الٰہی کا پیغامبر ہوتا ہے، اس کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت شمار ہوتی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (۱)

ترجمہ : جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

خود اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ: مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۲)

ترجمہ: جس چیز کا میرا رسول تمھیں حکم دے وہ کام کرو اور جن باتوں سے روکے ان سے باز آجاؤ۔

یہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت سے بے انتہاء محبت ہے، بے پناہ شفقت ہے، بلکہ محبت وشفقت کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کی قلبی کیفیات کو بیان کرنے سے قاصر ہیں اس لیے قرآن کریم نے اس کو حریص علیکم سے تعبیر کیا ہے، تو جو ذات بے انتہاء اور بے پایاں شفقت ومحبت کرتی ہو ہمارے انجام سے بخوبی واقف ہو، بالخصوص جب کہ اس کی واقفیت وحی الٰہی اور مشاہدہ کی صورت میں ہو، تو وہ ذات لازمی طور پر اس قابل ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے اور یہ اطاعت پیدا ہوتی ہے محبت کی انتہاء سے، جس قدر محبت میں کمال آتا جاتا ہے اسی قدر جذبہ اطاعت باکمال اور لازوال ہوتا چلا جاتا ہے اور اس محبت کو پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے جو ہمیں حقیقت کے قریب کرے، رسول کی اطاعت پر ابھارے، اللہ کی فرمانبرداری پر برانگیختہ کرے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محبت کرنے کی جتنی وجوہات ہوسکتی ہیں وہ ساری کی ساری رسول اللہ ﷺ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں:

پہلی وجہ کمال: اگر محبت کی وجہ کسی ذات کا باکمال ہونا ہے تو تمام کمالات میں مکمل کامل اور اکمل

❖ امیر عالمی اتحاد اہل السنّت والجماعت، پاکستان (۱) سورۃ النساء آیت: ۸۰ (۲) سورۃ الحشر آیت: ۷

ذات رسول اللہ ﷺ کی ہے، عزت وعظمت، فضیلت ومنقبت، شرف ومقام اور مرتبہ وکمال یہ سب کچھ اس باکمال ذات کا صدقہ ہے جن کی وجہ سے ان اوصاف کے حقائق سے دنیا واقف ہوئی ہے۔ عقل کامل، سوچ کامل، تدبر کامل، فکر کامل، شکر کامل، عبدیت کامل، انسانیت کامل، حیا کامل، سخا کامل، شجاعت کامل، وجاہت کامل، تمام اوصاف کامل۔ اسی کاملیت پر نگاہ دوڑاتے ہوئے قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہے ☆ تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

دوسری وجہ احسان: اگر محبت کی وجہ کسی ذات کا محسن ہونا ہے تو محسن کائنات ﷺ کے صرف مسلمانوں پر ہی نہیں تمام انسانوں پر بلکہ ساری مخلوقات پر آپ ﷺ کا احسان عظیم ہے۔ احسان کا یہ سلسلہ عالم ارواح سے عالم آخرت تک پھیلا ہوا ہے۔ عالم ارواح میں جب اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو ایک جگہ جمع فرما کر یہ سوال کیا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُم۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب سے پہلے روح محمد ﷺ نے جواب عنایت فرمایا: بَلٰی۔ کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں، آپ کا جواب سن کر تمام انبیاء کرام کی ارواح نے جواب دیا پھر درجہ بدرجہ تمام ارواح نے بَلٰی کا اقرار کیا۔

عالم دنیا میں آپ ﷺ کے احسانات کا نہ ختم ہونے والا طویل سلسلہ ہے، انسان کی تخلیق سے لے کر انسانیت کی معراج تک سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے دم قدم سے ہے، وجہ تخلیق کائنات آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ عالم آخرت چونکہ سب سے بڑا عالم ہے اس لیے اس میں آپ ﷺ کا احسان بھی سب سے بڑا ہوگا، آپ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ حساب وکتاب شروع فرمائیں گے، اتنا ہولناک وقت ہوگا انبیاء کرام علیہم السلام تک نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے صرف آپ ﷺ کے مبارک لبوں پر یارب امتی یارب امتی کی صدا ہوگی، خدا تعالی کے جلال کو جمال میں بدلنے کے لیے آپ ﷺ بہت طویل سجدہ فرمائیں گے، بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئے گی: اے محمد اپنا سر مبارک اٹھائیے، مانگیے آپ کو عطا کیا جائے گا، گناہ گاروں کی سفارش کیجیے آپ کی سفارش کو قبول کیا جائے گا۔ چنانچہ آپ میدان حشر میں جہاں کہیں) میزان، پل صراط وغیرہ پر(اپنی امت کو مشکل میں دیکھیں گے وہاں آکر اللہ تعالیٰ سے شفاعت کی درخواست کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی سفارش کو قبول فرما کر اس امت کے گناہ گاروں کو جہنم سے آزاد فرما کر جنت عطا فرمائیں گے۔ اتنے بڑے محسن کا حق بنتا ہے کہ آپ کی کامل اطاعت کی جائے، تاکہ ہم آپ کی شفاعت کے حقدار بن جائیں۔

تیسری وجہ جمال: اگر محبت کی وجہ کسی کا خوب صورت ہونا ہے، حسین وجمیل ہونا ہے، تو کائنات میں سب سے زیادہ حسین وجمیل آپ ﷺ کی ذات بابرکات ہے، آپ پیکر حسن وجمال، مجسم حسن و

جمال، منبع حسن و جمال اور مرکز حسن و جمال ہیں۔آپ ہی کے جلوؤں سے کائنات کا حسن اپنی روشنیاں بکھیر رہا ہے، آپ کی تابانیاں اور رعنائیاں ہر سو پھیل رہی ہیں، زمین وزمن، ارض وفلک، شمس وقمر اور شام و سحر الغرض خداتعالیٰ کی تمام خدائی کو آپ کے حسن و جمال نے احاطہ کر رکھا ہے۔قرآن کریم پڑھ کر دیکھ لیجیے آپ کی ذات مبارک کس طرح حسن و جمال کی مالا میں پروئی ہوئی ہے۔بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر معلوم ہوا کہ اگر وجہ محبت حسن و جمال بھی ہو تب بھی سب سے زیادہ محبت آپ ﷺ سے کرنی چاہیے۔

چوتھی وجہ اخلاق: اگر محبت کی وجہ اخلاق و کردار ہے، تو پھر انک لعلی خلق عظیم کے حقیقی مصداق ہی اس قابل ٹھہرتے ہیں کہ آپ سے محبت کی جائے، جس کے خلق عظیم کی گواہی قرآن کریم میں خالق کائنات خود دے رہے ہیں، ایسا بااخلاق انسان دنیا کہاں سے لائے گی جس کی اخلاق حسنہ کا اعتراف اس کے دشمن بھی کریں، صادق، امین، صلح جو، ہمدرد، مونس وغمخوار اور سخی و فیاض ذات درحقیقت ذات حبیب کبریاء ﷺ ہے۔الغرض وجوہ محبت کمالات ہوں یا احسانات، حسن و جمال ہو یا اخلاق و کردار ہر حوالے سے آپ ﷺ پوری انسانیت کے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔

جب دل میں محبت رسول موجزن ہو جائے تو اطاعت کرنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔آج ہمیں اپنے دل میں محبت پیدا کرنے کی ضرورت ہے محبت سے ہی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر محبت کو اطاعت کے قالب میں نہ ڈھالا جائے تو دعویٰ میں صداقت نہیں آسکتی۔

افسوس! صد افسوس! آج ہم اس جذبہ اطاعت سے دور ہو چکے ہیں، ہماری تنزلی آج بھی ختم ہو سکتی ہے اگر ہم بغاوت کو چھوڑ کر اطاعت کو اپنالیں، اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اطاعت رسول کے سانچے میں ڈھالیں، خوشی و غمی میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو اپنائیں، مقصد بعثت رسالت پر غور کریں، سمجھیں، اور دل و جان سے عمل کریں۔اطاعت کے بغیر دنیا میں ناکامی ہوگی، اگر اپنی روش کو نہ بدلا تو یہی ناکامی کل قیامت کو حسرت کا روپ دھار لے گی پھر انسان کہیں گے: یَا لَیْتَنَا أَطَعْنَا اللّٰه وَأَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (۱)

اے کاش ہم اللہ کی اطاعت کرتے اور رسول کی اطاعت کرتے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اطاعت رسول کا جذبہ عطاء فرمائے، اسی جذبہ کے تقاضوں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین

(۱) سورۃ الاحزاب آیت: ٦٦

آخری قسط

طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے ایک جائزہ

مولانا عتیق احمد بستوی❖

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ حیض میں طلاق دینے کے واقعہ سے ایک اور گتھی بھی سلجھتی ہے کہ زمانۂ حیض میں طلاق دینا اگر چہ شرعاً ممنوع ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس طلاق کو واقع مانا، اسی لئے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو رجوع کا حکم فرمایا، اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجوع کا حکم کیوں فرمائے، اسی طرح ایک وقت میں تین طلاق دینا اگر چہ ممنوع ہے، اس طرح طلاق دینے سے آدمی گناہگار ہوتا ہے، لیکن طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس طرح طلاق دینے کے واقعات پیش آئے آپ ﷺ اس پر سخت ناراض ہوئے، لیکن ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو آپ نے واقع مانا، اور بیوی کو شوہر کے لئے حرام ہوجانے کا فتوی دیا۔

اس مختصر تمہید کے بعد کتب حدیث سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے طلاق دینے کے واقعہ کو درج کیا جاتا ہے۔

"حدثنا حجاج: حدثنا یزید بن ابراهیم: حدثنا محمد بن سیرین: حدثنی یونس بن جبیر: سألت ابن عمر فقال: طلق ابن عمر امرأته وهی حائض، فسأل عمر النبی ﷺ، فأمره أن یراجعها ثم یطلق من قبل عدتها، قلت: أفتعتد بتلك التطلیقة؟ قال: أرأیت إن عجز واستحمق؟"(۱)

ترجمہ: یونس ابن جبیر نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا (کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے تو کیسا؟) تو فرمایا کہ ابن عمر نے (یعنی میں نے) اپنی بیوی کو حیض کی حالت

❖ استاذ حدیث وناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنو

(۱) صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب مراجعۃ الحائض، حدیث ۵۳۳۵، ص ۷۴۰، صحاح ستہ

میں طلاق دی تھی، تو حضرت عمرؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تو آنحضور ﷺ نے حکم دیا کہ ابن عمر اپنی بیوی سے رجعت کرلے، پھر طلاق دے اس کی عدت سے پہلے (یعنی طہر کی حالت میں طلاق دے) میں نے پوچھا اس طلاق کا شمار ہوگا؟ انہوں نے فرمایا: بتلاؤ اگر طلاق دینے والا احکام شرع کے بجالانے سے عاجز ہو یا احمق بیوقوف ہو تو کیا علاج ہے، یعنی طلاق کا شمار ہوگا۔(۱)

"حدثنا يحيىٰ بن يحيىٰ التميمي قال: قرأت على مالك بن أنس عن نافع عن ابن عمر أنه طلق امرأته وهي حائض في عهد رسول الله ﷺ، فسأل عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك، فقال له رسول الله ﷺ مره فليراجعها، ثم ليتركها حتى تطهر، ثم تحيض ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد، وإن شاء طلق قبل أن يمس، فتلك العدة التي أمر الله عزوجل أن يطلق لها النساء"(۲)

ترجمہ: نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ عمر بن الخطاب نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم انہیں رجعت کرنے کا حکم دو، پھر اپنی بیوی کو چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائے، پھر ناپاکی کی مدت آئے، پھر پاک ہو، پھر اس کے بعد اگر وہ چاہے تو رکھے اور اگر چاہے تو تعلق قائم کرنے سے پہلے طلاق دے دے، یہی وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالی نے طلاق کا حکم دیا ہے۔

"حدثنا القعنبي عن مالك عن نافع، عن عبد الله بن عمر أنه طلق امرأته وهي حائض على عهد رسول الله ﷺ، فسأل عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك؟ فقال رسول الله ﷺ: مره فليراجعها ثم ليمسكها حتى تطهر ثم تحيض ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد ذلك وإن شاء طلق قبل أن يمس، فتلك العدة التي أمر الله سبحانه أن تطلق لها النساء"(۳)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں حکم دو کہ وہ رجعت کریں، پھر اس کو اپنے پاس رکھیں یہاں تک کہ وہ پاک

---

(۱) نصر الباری، اردو ترجمہ صحیح البخاری

(۲) صحیح مسلم، باب تحریم الطلاق الحائض بغیر رضاها وأنه خالف وقع الطلاق ویؤمر برجعتها، حدیث:۱۴۷۱

(۳) سنن ابی داؤد، باب فی طلاق السنة، حدیث ۲۱۷۹

ہوجائے، پھر ناپاکی کا زمانہ آئے پھر پاک ہوجائے، اس کے بعد اگر چاہیں تو رکھیں اور چاہیں تو تعلق قائم کرنے سے قبل طلاق دیدیں، یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق اللہ تعالی نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔

"حدثنا قتيبة بن سعيد، حدثنا حماد بن زيد عن أيوب عن محمد بن سيرين عن يونس بن جبير، قال: سألت ابن عمر عن رجل طلق امرأته وهي حائض، فقال: هل تعرف عبدالله بن عمر؟ فانه طلق امرأته وهي حائض، فسأل عمر النبي ﷺ، فأمره أن يراجعها، قال: قلت: فيعتد بتلك التطليقة؟ فقال: فمه، أرأيت إن عجز واستحمق؟" (۱)

ترجمہ: یونس بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے ناپاکی کی مدت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیا ہو، انہوں نے کیا تم عبداللہ بن عمر کو جانتے ہو؟ انہوں نے بھی اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ نے انہیں رجعت کرنے کا حکم دیا، راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کیا اس طلاق کا اعتبار ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ اگر طلاق دینے والا احکام شرع کو بجالانے سے عاجز ہو یا بیوقوف ہو تو کیا علاج ہے؟

ہمارے فاضل جج صاحبان نے سورۂ نساء کی آیات ۳۴ اور ۳۵ میں اجتہاد کر کے وقوع طلاق کے لئے جو شرطیں عائد کی ہیں اس نہج پر اگر قرآن سے مسائل کا استنباط کیا جانے لگا، اور اجتہاد کی گرم بازاری ہوئی تو پورا دین ہی ملیامیٹ ہوجائے گا، اور اسلامی قانون کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل ہوجائے گا، غنیمت ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ عورت کو طلاق دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے مار پیٹ کر سیدھا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہو، کیونکہ سورۂ نساء کی آیت ۳۴ میں جہاں نصیحت کرنے اور بستر الگ کرنے کا ذکر ہے وہیں ہلکے انداز سے مارنے کا بھی ذکر ہے (واضربوھن)۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم صرف قانون کی کتاب نہیں ہے، اس میں بہت ساری اخلاقی تعلیمات وہدایات بھی ہیں، وعظ وتذکیر کے مضامین بھی ہیں، اگر ہر سورت اور آیت کو قانون قرار دے کر اس سے احکام نکالے جائیں گے تو بہت دشواری پیش آئے گی، اور قرآن کے معانی اس سے بہت مختلف ہوجائیں گے جس طرح رسول اللہ ﷺ، صحابہ، تابعین، فقہاء امت نے انہیں سمجھا ہے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ججز ہمارے لئے قابل احترام ہیں لیکن ان کے سارے ادب واحترام کے ساتھ ہمیں یہ لکھنے میں کوئی جھجک اور تکلف نہیں ہے کہ وہ حضرات عربی زبان وادب سے بالکل

(۱) جامع ترمذی، باب ماجاء فی طلاق السنۃ، حدیث ۱۱۷۵

ناواقف ہیں، اور جن وکلاء کی معلومات کو بنیاد بنا کر ججز نے سورۂ نساء کی آیت ۳۴ اور ۳۵ کو طلاق واقع ہونے کے لئے شرط قرار دیا ہے، وہ حضرات بھی اپنی تمام تر قانونی قابلیت کے باوجود عربی زبان وادب اور اسلامی علوم سے بالکل ناآشنا ہیں، اس بارے میں ان کا سرمایہ علم قرآن کے بعض انگریزی تراجم ہیں، گوہاٹی ہائی کورٹ کے جسٹس بحر الاسلام سے پہلے ہمیں کوئی شخص نہیں ملتا جس نے سورہ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں مذکور امور کو وقوع طلاق کے لئے شرط قرار دیا ہو۔

قرآن کریم کی تفسیر میں ہزاروں ہزار کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں، لائبریریوں میں تفسیر کی کتابوں کا سیکشن دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے اور اس کے معانی واحکام کی دریافت میں کتنا عظیم علمی سرمایہ فراہم ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں لاکھوں ذہین ترین انسانوں کی دماغی اور علمی صلاحیتیں صرف ہوئیں، لیکن اس وسیع تر علمی لٹریچر میں کہیں کوئی بات ایسی نہیں ملے گی جو اس نقطۂ نظر کی تائید کرے کہ سورہ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں مذکور امور طلاق واقع ہونے کے لئے شرط ہیں۔

اسلامی قانون دنیا کا مکمل ترین قانون ہے، فقہ اسلامی کا عظیم الشان لٹریچر اسلامی قانون کی وسعت اور عظمت کی گواہی دیتا ہے، اگر ہم صرف قانون طلاق پر لکھی ہوئی تحریروں کو جمع کریں تو بلا مبالغہ ایک لاکھ صفحات سے کم میں انہیں اکھٹا نہیں کرسکتی ہیں، طلاق کی حقیقت، قسمیں، احکام اور شرطوں پر بہت تفصیل اور دلائل کے ساتھ فقہاء نے گفتگو کی ہے، وقوع طلاق کی شرطیں، طلاق کا ایک اہم ترین موضوع ہے لیکن فقہ اسلامی کے پورے لٹریچر میں کوئی ایک حوالہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا کہ کسی نے طلاق واقع ہونے کے لئے ان چیزوں کو شرط قرار دیا ہو جنہیں جسٹس بحر الاسلام اور شمیم آرا کیس کا فیصلہ کرنے والے ججز صاحبان سورہ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ کے حوالہ سے شرط قرار دینے کی کوشش کررہے ہیں، اس طرح کے بے سروپیر کے فیصلے نہ صرف قرآن کریم اور اسلامی قانون کی توہین کے مرادف ہیں بلکہ ایسے بے بنیاد فیصلوں سے ہماری عدالتوں اور ججوں کا قد بہت چھوٹا ہوجاتا ہے، اور قانون کی دنیا میں ان کی حیثیت بری طرح گر جاتی ہے، اس لئے ہمارے فاضل ججز کی ذمہ داری ہے کہ ملک کے وقار اور اپنی عزت کو بچانے کیلئے ایسے بودے اور بے بنیاد فیصلوں سے گریز کریں، اور قرآن کریم، احادیث نبویہ نیز اسلامی قانون کو سمجھنے کے لئے مستند کتابوں اور معتبر اہل علم کی طرف رجوع کریں۔

قسط (۳)

مساجد میں خواتین کے آنے کے شرعی احکام

مولانا امانت علی قاسمی ❖

خواتین کے لیے گھر میں نماز پڑھنے کی شرعی حیثیت

بنیادی طور پر خواتین کے لیے گھر میں رہنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور بلا ضرورت گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے؛ اسی لیے نماز کے تعلق سے بھی گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور گھر میں نماز پڑھنے کو بہتر اور افضل قرار دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ تمام فقہاء امت نے عورت کے گھر میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ جو ثواب مرد حضرات کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر ملتا ہے وہی اجر عورت کو تنہا گھر میں نماز پڑھنے پر ملے گا اس لیے کہ وہ عورت حضور ﷺ کے امر کی اطاعت کر رہی ہے۔

اتفق الفقهاء منهم الحنفية والمالكية على انه لا يرخص للشابات من النساء الخروج إلى الجمعة والعيدين وشيء من الصلاة، لقوله تعالى: (وقَرْن في بيوتكن)(۱) والامر بالقرار نهى عن الانتقال، ولان خروجهن سبب الفتنة بلا شك، والفتنة حرام، وما ادى إلى الحرام فهو حرام.(۲)

خواتین کا مسجد میں آنے کے سلسلے میں ائمہ اربعہ کا موقف

ائمہ اربعہ کے اقوال کا اگر جائزہ لیا جائے تو بنیادی قول کراہت کا معلوم ہوتا ہے، اگر چہ بعض صورتوں میں جواز کی بھی رائے تقریبا ائمہ کے یہاں ہے لیکن جوان عورتوں کے لیے جن میں فتنہ کا اندیشہ ہو مسجد میں نماز کے لیے نکلنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

فقہاء احناف کے یہاں متقدمین اور متاخرین کی آراء میں اختلاف ہے، متقدمین میں امام صاحبؒ کے یہاں جوان عورتوں کے لیے مسجد میں نماز کے لیے آنا مطلقا مکروہ ہے جب کہ بوڑھی عورت

❖ استاذ دار العلوم وقف دیوبند

(۱) الاحزاب ۳۳/۳۳ (۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۳۲۵

کے لیے فجر، مغرب اور عشاء میں اجازت ہے اور صاحبین کے لیے بوڑھی عورت کے لیے مطلقا اجازت ہے جب کہ متاخرین نے بوڑھی عورتوں کے لیے بھی مطلقا کراہت کا قول نقل کیا ہے اور اسی کو فساد زمان کی وجہ سے مفتی بہ قرار دیا ہے۔ چناں چہ فقہ حنفی کا قول علامہ حصکفی لکھتے ہیں: **ویکرہ حضورھن الجماعة) ولو لجمعة وعید ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا لیلا (علی المذھب) المفتی بہ لفساد الزمان، واستثنی الکمال بحثا العجائز والمتفانیة.(۱)**

علامہ شامی فرماتے ہیں: **قولہ ولو عجوزا لیلا) بیان للإطلاق :ای شابة او عجوزا نھارا او لیلا (قولہ علی المذھب المفتی بہ) ای مذھب المتاخرین .قال فی البحر :وقد یقال ھذہ الفتوی التی اعتمدھا المتاخرون مخالفة لمذھب الإمام وصاحبیہ، فإنھم نقلوا ان الشابة تمنع مطلقا اتفاقا .واما العجوز فلھا حضور الجماعة عند الإمام إلا فی الظھر والعصر والجمعة ای وعندھما مطلقا، فالإفتاء بمنع العجائز فی الکل مخالف للکل، فالاعتماد علی مذھب الإمام (۲)**

اس میں علامہ شامی نے امام صاحب کے قول پر اعتماد کرنے کی بات کہی ہے یعنی بوڑھی عورتوں کے لیے نکلنے کی اجازت ہوگی، صاحب ہدایہ نے بھی جوان عورتوں کے لیے کراہت کا قول نقل کیا ہے، بوڑھی عورتوں کے لیے کراہت کا قول نقل نہیں کیا ہے یعنی امام صاحبؒ کے قول کو اختیار کیا ہے چناں چہ فرماتے ہیں: **ویکرہ لھن حضور الجماعات یعنی الشواب منھن؛ لما فیہ من خوف الفتنة،ولا باس للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء ،(۳)**

علامہ اکمل الدین بابرتی نے متاخرین کے قول کو اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فتوی عورتوں کے مسجد میں آنے کے کراہت پر ہے: **والفتوی الیوم علی کراھة حضورھن فی الصلوات کلھا لظھور الفساد.(۴)**

عمم المتاخرون المنع للعجائز والشواب فی الصلوات کلھا لغلبة الفساد فی سائر الاوقات.(۵)

اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ متقدمین کے یہاں بوڑھی عورتوں کے لیے گنجائش ہے؛ لیکن متاخرین نے مزید بگڑتے حالات کو دیکھ کر بوڑھی عورتوں کے لیے کراہت پر فتوی دیا ہے۔

(۱) الدر المختار مع رد المحتار، ۱/۵۶۶ (۲) رد المحتار، ۱/۵۶۶ (۳) الہدایة مع البنایہ، ۳/۲۵۴
(۴) العنایة، شرح الہدایة، ۱/۳۶۶ (۵) فتح القدیر، ۱/۳۶۶

فقہ مالکی میں بھی جوان عورتوں کے لیے مسجد میں آکر نماز پڑھنا مکروہ ہے، ہاں اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو نکلنے کو ہی ناجائز قرار دیا ہے اور بوڑھی عورت کے لیے مسجد جانے کی اجازت ہے۔

وحضور شابة (ش) ای وکره حضور شابة یرید غیر مخشیة الفتنة وإلا منع حضورها(۱)

خَلْفَ صُفُوفِ الرِّجَالِ) كَمَا تَقَدَّمَ فِي صَلَاتِهِنَّ غَيْرَ الْجُمُعَةِ، وَلَمَّا كَانَ يُتَوَهَّمُ مِنْ بَيَانِ مَحَلِّ وُقُوفِهِنَّ جَوَازُ خُرُوجِهِنَّ لِصَلَاتِهَا وَإِنْ كُنَّ شَوَابَّ قَالَ كَالْمُسْتَدْرِكِ عَلَى مَا سَبَقَ :(وَلَا تَخْرُجُ إِلَيْهَا) اَیْ إِلَى صَلَاةِ الْجُمُعَةِ (الشَّابَّةُ) عَلَى جِهَةِ الْكَرَاهَةِ حَيْثُ لَمْ تَكُنْ مَخْشِيَّةَ الْفِتْنَةِ وَإِلَّا حَرُمَ حُضُورُهَا، وَاَمَّا الْمُتَجَالَّةُ فَيَجُوزُ حُضُورُهَا، (۲)

شیخ احمد الدردیر نے شرائط کے ساتھ جوان عورتوں کے لیے بھی نکلنے کی اجازت دی ہے؛ البتہ دسوقی نے اس پر حاشیہ لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ حسین وجمیل عورتوں کے لیے مسجد میں آنے کی ممانعت ہے؛ اس لیے کہ یہاں فتنہ کا اندیشہ ہے۔

(وَ) جَازَ (خُرُوجُ مُتَجَالَّةٍ)لَا اَرَبَ لِلرِّجَالِ فِيهَا غَالِبًا (لِعِيدٍ وَاسْتِسْقَاءٍ) وَالْفَرْضُ اَوْلَى (وَ) جَازَ خُرُوجُ (شَابَّةٍ لِمَسْجِدٍ) لِصَلَاةِ الْجَمَاعَةِ وَلِجِنَازَةِ اَهْلِهَا وَقَرَابَتِهَا بِشَرْطِ عَدَمِ الطِّيبِ وَالزِّينَةِ وَاَنْ لَا تَكُونَ مَخْشِيَّةَ الْفِتْنَةِ وَاَنْ تَخْرُجَ فِي خَشِنِ ثِيَابِهَا وَاَنْ لَا تُزَاحِمَ الرِّجَالَ وَاَنْ تَكُونَ الطَّرِيقُ مَاْمُونَةً مِنْ تَوَقُّعِ الْمَفْسَدَةِ وإِلَّا حَرُمَ---قوله وخروج شابة) ای غیر فارهة فی الشباب والنجابة واما الفارهة لا تخرج اصلا .(قوله لصلاة الجماعة) ای غیر الجمعة ولا تخرج لعید ولا لاستسقاء ولا لجمعة لانها مظنة الازدحام ولا لمجالس علم او ذکر إن کانت منعزلة عن الرجال وخروجها لما ذکر ممنوع۔(۳)

و کره (حضور شابة) غیر مخشیة الفتنة لکثرة الزحام فی الجمعة بخلاف غیر الجمعة فیجوز لقلة ذلك واما المخشیة فیحرم مطلقا حضورها وجاز لمتجالة (۴)

فقہ شافعی میں بھی جوان عورتوں کے لیے مسجد میں آنے کو مکروہ قرار دیا ہے؛ اس لیے کہ یہ فتنہ کا سبب ہے اور بوڑھی عورتوں کے لیے مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔

---

(۱) شرح مختصر خلیل، ۲/۸۸
(۲) الفواکہ الدوانی علی رسالۃ ابن ابی زید القیر وانی ۱/۲۶۳
(۳) الشرح الکبیر للدسوقی، ۱/۳۶۶
(۴) الشرح الکبیر، ۱/۳۸۶

والنساءُ فی بیوتھنَّ افضلُ، ویُکرہُ حضورُ المسجدِ لمشتھاۃٍ اوْ شابَّۃٍ، لا غیرِھما عندَ امنِ الفتنۃِ. (۱)

المجموع شرح المہذب میں نووی لکھتے ہیں: واما النساء فجماعتھن فی البیوت افضل لما روی ابن عمر رضی اللہ عنہ قال :قال رسول اللہ ﷺ "لا تمنعوا نساء کم المساجد وبیوتھن خیر لھن "1فإن ارادت المراۃ حضور المسجد مع الرجال فإن کانت شابۃ او کبیرۃ یشتھی مثلھا کرہ لھا الحضور وإن کانت عجوزاً لا تشتھی لم یکرہ لما روی ان النبی ﷺ نھی النساء عن الخروج إلا عجوزاً فی منقلھا. (۲)

نووی نے اس کے آگے کہا کہ جوان عورت اگر شوہر سے اجازت طلب کرے تو شوہر اس کی اجازت نہ دے، ہاں بوڑھی عورت کو اجازت دے۔

جماعۃ النساء فی البیوت افضل من حضورھن المساجد للحدیث المذکور قال اصحابنا وصلاتھا فیما کان من بیتھا استر افضل لھا لحدیث عبد اللہ ابن مسعود إن النبی ﷺ قال "صلاۃ المراۃ فی بیتھا افضل من صلاتھا فی حجرتھا وصلاتھا فی مخدعھا افضل من صلاتھا فی بیتھا "رواہ ابو داود بإسناد صحیح علی شرط مسلم وإن ارادت المراۃ حضور المسجد للصلاۃ قال اصحابنا إن کانت شابۃ او کبیرۃ تشتھی کرہ لھا وکرہ لزوجھا ووليھا تمکینھا منہ وإن کانت عجوزا لا تشتھی لم یکرہ. (۳)

فقہ شافعی کے بڑے عالم شیخ زکریا انصاری نے بھی جوان عورتوں کے لیے مسجد میں آنے کو مکروہ قرار دیا ہے، ساتھ ہی انہوں نے اس روایت کا جواب بھی دیا ہے جس میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے روکنے سے منع کیا گیا ہے۔

انھا للنساء فی بیوتھن احب منھا فی المساجد وغیرھا، بل یکرہ حضور الشابۃ، والکبیرۃ المشتھاۃ، ویکرہ للزوج والولی تمکینھما منہ لما فی الصحیحین عن عائشۃ لو ان رسول اللہ ﷺ رای ما احدث النساء لمنعھن المسجد کما منعت نساء بنی إسرائیل. والنھی فی خبر مسلم لا تمنعوا إماء اللہ مساجد اللہ للتنزیہ؛ لان الحق الواجب لا یترک للفضیلۃ، او محمول علی عجوز لا تشتھی فإنہ یندب للزوج ان یاذن

(۱) عمدۃ السالک وعدۃ الناسک، ۱/۶۶ (۲) المجموع شرح المہذب ۴/۱۹۷
(۳) المجموع باب الجماعۃ، ۴/۱۹۸

لهـا إذا استاذنته، وامن المفسدة لخبر مسلم إذا استاذنكم نساوكم بالليل إلى المسجد فاذنوا لهن (۱)

فقہ حنبلی میں بھی خوبصورت خواتین کے لیے مسجد میں آنے کومکروہ قرار دیا گیا ہے اور دیگر عورتوں کو آنے کی اجازت دی ہے۔

ويكـره لحسناءَ حضورُها مع الرجال .ويبـاحُ لغيرِ الحسناءِ حضورُ الجماعةِ مع الرجال. (۲)

و كرهه القاضى وابن عقيل وغيرهما للشابة وهو اشهر. (۳)

شیخ عثیمن نے حدیث کی روشنی میں لکھا ہے کہ یہاں دو خطاب ہے، ایک خطاب اولیاء کے لیے ہے کہ اگر وہ عورت مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے اجازت طلب کرے تو اولیاء منع نہ کرے، دوسرا خطاب عورتوں سے ہے کہ ان کے لیے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے؛ اس لیے بجائے مسجد میں جانے کے گھر میں نماز پڑھیں؛ لیکن اگر اجازت طلب کریں تو روکا نہ جائے؛ اس لیے کہ اللہ کے بندی کو اللہ کے گھر میں جانے سے نہیں روکا جاسکتا ہے۔

لا تـمـنـعوا إماءَ اللهِ مساجدَ اللهِ، وبيوتُهُنَّ خيرٌ لَهُنَّ 1))، تـضمن خطابين 1:ـ خطاباً موجهاً للاولياءِ 2ـ خطاباً موجهاً للنساءِ .اما الاولياءُ؛ فلا يَمنعونَ النِّساءَ، واما النساءُ :فبيوتُهنَّ خيرٌ لَهُنَّ.(۴)

ويباح للنساء حضور صلاة الجماعة فى المساجد بإذن ازواجهن. (۴)

(جاری)

❁……❁……❁

(۱) الغرر البهية فى شرح البهجة الوردية ۱/۴۰۴
(۲) نيل المارب بشرح دليل الطالب، ۱/۱۷۱
(۳) الفروع وتصحيح الفروع، ۲/۴۲۲
(۴) الشرح الممتع على زاد المستقنع ۴/۲۰۳
(۵) الملخص الفقهى، ۱/۱۹۸

آں کتاب زندہ قرآن حکیم

دورِ غلبہ واقتدار میں اہل کفر کی نفسیات

کھلی دشمنی، بدزبانی، دست درازی، گھر واپسی

مولانا رفاقت حسین قاسمی ❖

اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّیَبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ وَاَلْسِنَتَھُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ. (سورۃ الممتحنہ، آیت:۲)

ترجمہ: اگر تم ان کے ہاتھ آجاؤ تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اپنے ہاتھ اور زبانیں پھیلا پھیلا کر تمہارے ساتھ برائی کریں گے اور ان کی خواہش یہ ہے کہ تم کافر ہو جاؤ۔ (تقی عثمانی)

یہ آیت سورۃ الممتحنہ کی ہے اور ایک خاص نوعیت کے واقعے کے نتیجے میں نازل ہونے والے سلسلۂ آیات میں دوسرے نمبر پر ہے۔ پس منظر کو واضح کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بات کچھ ماقبل سے شروع کی جائے۔

ہم واقف ہیں کہ سن ۶ ہجری میں پیغمبر ﷺ نے تقریباً پندرہ سو صحابۂ کرامؓ کے ہمراہ عمرے کی نیت سے مکے کا سفر کیا، اہل مکہ کی طرف سے رکاوٹ ڈالی گئی اور قصہ مختصر یہ کہ حدیبیہ کے مقام پر مذاکرات ہوئے اور گزشتہ کئی برسوں سے حالت جنگ میں چلی آرہی مکی، مدنی دونوں طاقتوں کے درمیان دس سال کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ طے پایا۔

عرفی دستور کے مطابق قبیلۂ بنو بکر اہل مکہ اور قبیلۂ بنو خزاعہ اہل مدینہ کے حلیف بن کر اِس معاہدے کا حصہ بن گئے؛ مگر ابھی معاہدے کو پورے دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا، جس میں در پردہ اہل مکہ نے بھی شرکت کی اور فراہمیٔ اسلحہ کے ساتھ ساتھ بنو بکر کو افرادی قوت بھی فراہم کی۔ ظاہر ہے کہ حلیف پر حملہ اصل فریق ہی پر حملہ تھا، جس نے معاہدے کو عملاً یک طرفہ طور پر کالعدم کر دیا۔ اس کے باوجود آپ علیہ السلام نے معاہداتی آداب کی پاس داری کی اور سفارتی رابطے کے ذریعے

❖ استاذ دار العلوم وقف دیوبند

اہل مکہ کے سامنے کچھ تجاویز رکھیں۔ اہل مکہ نے معاہدۂ حدیبیہ کی منسوخی کی تجویز کو اختیار کیا اور یوں یہ معاہدہ قانونی اور حقیقی طور پر بھی باقی نہ رہا۔ اس کے بعد اگرچہ اہل مکہ کی طرف سے تجدید معاہدہ کی کوشش بھی کی گئی؛ مگر تب تک آپ علیہ السلام نے اہل مکہ کے متکبرانہ رویے کی وجہ سے اُن کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کرلیا تھا، لہٰذا آپ علیہ السلام نے سمتِ سفر کی وضاحت دیئے بغیر حضرات صحابہ کرامؓ کو جہادی سفر کی تیاریوں کا فرمان جاری کردیا۔

نبوی منشاء واضح تھا کہ اہل مکہ کو مدینے میں جنگی پیمانے پر ہورہی تیاریوں کا علم نہیں ہونا چاہئے (اور وحی سماوی کی بروقت رہنمائی نے یہ بھی واضح کردیا کہ الٰہی منشاء بھی یہی تھا) کہ اس درمیان وہ واقعہ پیش آگیا جو اس سلسلۂ آیات کے نازل ہونے کا سبب بنا۔

ہوا یہ کہ ایک قدیم الاسلام اور بہ طور خاص معرکۂ بدر میں شریک صحابی، حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ اس موقع پر بڑی غلطی کر بیٹھے کہ انہوں نے کچھ مکی سرداران کے نام ایک خط لکھا، جس میں آپ علیہ السلام کے مکے کی جانب پیش قدمی کا راز ظاہر کیا گیا تھا اور مکے جانے والی ایک خاتون کے ذریعہ وہ خط پہنچوانے کا بندوبست کیا۔ حدیث وسیرت کی کتابوں میں تفصیل موجود ہے کہ آپ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا اور آپ نے مسافر عورت کے ملنے کی جگہ تعیین کے ساتھ مدینے سے دو تیز رفتار سوار روانہ کئے جنہوں نے وہ خط لاکر آپ علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا۔

وہی مسجد نبوی اور وہی عدالت، حضرت حاطب سے جواب طلبی کی گئی تو حضرت حاطب نے بیان صفائی دیتے ہوئے بتلایا کہ میرا ارادہ کوئی نقصان پہنچانے کا نہیں تھا بلکہ نمبر ایک تو یہ کہ میں نے مکے میں موجود اپنے اہل وعیال کی محبت اور ان کی حفاظت کی امید میں یہ غلطی کرڈالی کہ شاید میرا یہ احسان اہل مکہ کو میرے گھر والوں پر ظلم وزیادتی کرنے سے روک سکے اور نمبر دو یہ کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ فتح مکہ تو آپ کے لئے مقدر ہے۔ اہل مکہ کو آپ کے ارادۂ لشکر کشی کا علم ہوجانے کے باوجود بھی مکہ بہرحال فتح ہوکر رہے گا۔

گوکہ اس موقع پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے مثالی کردار کا اظہار کرتے ہوئے سزا دیئے جانے کی اجازت چاہی مگر آپ علیہ السلام نے حضرت حاطب کے بیان صفائی کو مبنی برصداقت قرار دیتے ہوئے ان پر اعتماد کیا اور اسلام کے لئے ماضی میں کی گئی ان کی خدمات کا حوالہ دے کر ان کو معاف کردیا۔

پس منظر کی اس دراز نفسی کے بعد آیئے قرآن کی طرف آتے ہیں کہ اگرچہ حضرت حاطب کو معافی دے دی گئی اور قانونی طور پر وہ سزا سے بچ گئے مگر اس سلسلے میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں اخلاقی اعتبار سے آخری حد تک تنبیہ کا اسلوب اختیار کیا گیا اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ایسے حساس اور نازک

مواقع سے متعلق گائڈلائن پوری طرح واضح کردی گئی۔

جو کچھ کہا گیا اس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک تو تصویر کا ایک رخ دکھاتے ہوئے مثبت طور پر سمجھایا گیا کہ سرکاری راز دشمن کے سامنے ظاہر کرنا کوئی سرسری سی بات نہیں ہے بلکہ یہ دشمن سے دوستی ہی کا علامتی اظہار ہے اور تم دوستی کا یہ رویہ میرے اور اپنے دشمن کے ساتھ کس طرح روا رکھ سکتے ہو، تم جہاد فی سبیل اللہ اور رضائے الٰہی کی راہ عزیمت کے مسافر ہوکر خفیہ طور پر اظہار مودت کے مجرم کیوں بنتے ہو، تمہارا حریف محض تمہارے ایمان باللہ کی وجہ سے تمہارا دشمن بنا ہے اور اسی بنا پر اس نے تمہیں اور تمہارے رسول کو دیس نکالا دیا ہے، تم اپنے اہل وعیال کے حق میں موہوم سی خیر خواہی کے بدلے ملت کے اجتماعی مفاد کا سودا نہیں کرسکتے، تمہیں اس باب میں ابراہیمی اسوے پر عمل کرنا چاہئے جنہوں نے اپنے گھرانے سے علانیہ برأت کا اظہار کیا اور کھلی عداوت کا برملا اعلان کیا، تمہارے لئے بھی یہی لازم ہے کہ اہل کفر کے لئے کھلی عداوت کا اظہار کرو، یہ معاملہ باہمی رشتہ داری کا نہیں ہے جس میں قطع رحمی کرنے والے کے ساتھ بھی صلہ رحمی مطلوب ہوتی ہے، بلکہ اہل کفر کے ساتھ صلح و جنگ اور عداوت و محبت کے باب میں برابری کی سطح پر معاملہ کرنا ہی اصل منصفانہ طرزِ عمل ہے۔ اہل کفر کے ساتھ یک طرفہ رواداری اور اظہار یک جہتی محض بھولے پن اور سیاسی لاشعوری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اہل کفر کے لئے تو (بقول شاعر) واضح کردیا جانا چاہئے کہ

تعلق جو بھی رکھو، سوچ لینا ۞ کہ ہم رشتہ نبھانا جانتے ہیں

حالت جنگ میں دشمن کے ساتھ اس بے موقع خیر خواہی سے نفع کی تو کوئی امید نہیں ہے، ہاں یہ یقینی نقصان ضرور ہوگا کہ ایسا کرنے والا منزل رسی کی ضامن حقیقی صراطِ مستقیم سے دور جا پڑے گا۔

پھر ہماری آج کی زیر درس آیت کے ذریعہ تصویر کا دوسرا رخ رکھا کر اہل ایمان کو غیرت بھی دلائی گئی اور اہل کفر کی طرف سے کسی بھی طرح کی جھوٹی امیدیں باندھے رکھنے کی بالکلیہ بیخ کنی کردی گئی کہ تم اہل کفر کی طرف سے کسی دھوکے میں نہ رہنا، باطل کی نفسیات ہی یہ ہے کہ مغلوب ہوتا ہے تو ہر سامنے والے کو خدا بنا لیتا ہے اور غالب آتا ہے تو ستم گر اور ستم ایجاد بن جاتا ہے۔ یاد رکھنا کہ اگر کبھی اہل کفر کو یہ موقع مل جائے کہ تم ان کے ہتھے چڑھ جاؤ اور وہ تم پر قابو پالیں تو پھر ان کی چھپی عداوت کھل کر سامنے آجائے گی۔ وہ برسر عام تمہارے ساتھ بدزبانی اور بدتہذیبی سے پیش آئیں گے، مزید موقع ملا تو ہجومی تشدد (Moblincihng) سے بھی انہیں کوئی دریغ نہ ہوگا اور وہ تمہاری جان کے درپے ہوجائیں گے یا یہ کہ نمبر چار ان کی وہ ہمیشہ کی خواہش پوری ہوجائے کہ تم بھی کفر اختیار کرکے انہیں کے جیسے بن جاؤ، یعنی انجام کار ان کا رویہ تمہارے لئے اس کے سوا نہیں ہوگا کہ تم جان یا ایمان میں سے صرف ایک چیز ہی بچا سکتے ہو۔

درس

سبحان اللہ! کیسا عظیم الشان ہے یہ دوام آشنا ہدایت نامہ ''القرآن'' جس کا مضمون ہی نہیں، ہر ہر تعبیر دائمی ہے۔ چودہ سو سال سے زائد کے طویل دورانئے میں ہر گزرتے دن کے ساتھ قرآن کریم کی جلوہ نمائیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے اور ہو رہا ہے، نہ اس کا حسن ظاہر پھیکا پڑا ہے اور نہ ہی اس کے جہان معنی میں کوئی کمی آئی ہے۔ تاریخ اور تجربہ تسلسل کے ساتھ اس کا شاہد ہے کہ قاری جب کسی خاص صورتِ حال میں رہنمائی کا طالب بن کر مطالعۂ قرآن کرتا ہے تو قرآن کریم کی کوئی نہ کوئی آیت اچانک اس کے سامنے آکر ایسے ٹھہر جاتی ہے کہ قاری بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ واقعی یہ آیت اسی موقع کے لئے ہے اور ایسا لگتا ہے کہ گویا ابھی اتر رہی ہے۔ سرنامۂ مضمون میں مذکور ہماری آج کی زیر درس آیت پر دوبارہ نظر ڈالئے اور پھر پوری توجہ اور سنجیدگی سے اپنے گرد و پیش کے منظر نامے کو دیکھئے تو خود بہ خود واضح ہو رہا ہے کہ آیت ہمیں کیا پیغام دے کر ہماری تربیت کر رہی ہے اور آیت سے ہمیں کیا سبق لے کر اپنے طرزِ عمل میں اختیار کرنا چاہئے۔ اہل کفر کو حاصل ہونے والی بلندی، ان کو کس قدر پستی میں لے جاتی ہے، آیت میں اسی کا بیان ہے اور اس الٰہی بیان کی تصدیق جیسی کچھ ہو رہی ہے کھلی آنکھوں دیکھی جا سکتی ہے۔ آیت سے ملنے والے سبق میں ایک آخری بات یہ بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ''اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ''میں جو فرمایا گیا ہے کہ ''اگر تم ان کے ہاتھ آجاؤ'' تو اس سے پبلک کی سطح پر قابو پالینا بھی مراد ہے جس کا اظہار بدزبانی، ہجومی حملے اور زبردستی کفر بلوانے کے ذریعہ ہوتا ہے اور مزید غور کیجئے تو اس سے حکومتی سطح پر قابو پالینا تو اس آیت کی اعلیٰ سطحی مراد کی صورت محسوس ہوتا ہے، اس لئے کہ پھر تو پہلے مرحلے ''یکونوا لکم أعداء'' (تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے) سے چوتھے اور آخری مرحلے ''و ودوا لو تکفرون'' (اور ان کی خواہش یہ ہے کہ تم کافر بن جاؤ) تک پہنچنا قانون کے ذریعہ مزید آسان ہو جاتا ہے، جس کی سب سے واضح مثال ''اصحابِ کہف'' کا وقعہ ہے کہ ان نوجوانوں نے اپنا گھر چھوڑا ہی اس لئے تھا کہ ایمان کے ساتھ وہاں رہنا اکثریتی جبر اور حکومتی قانون کی وجہ سے ناممکن ہو گیا تھا۔

آخر میں اس یقین کو بھی تازہ کئے لیتے ہیں کہ اس جیسی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اہل ایمان کو اب جو مشکل بھی پیش آتی ہے وہ بالعموم اولین اہل ایمان کو پیش آچکی ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ قرآنی آیات کی تصریحات و تلمیحات میں موجود اس مشکل کے حل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ پھر اسی حل کو اپنا کر راہ کی رکاوٹیں دور کی جا سکیں۔ فطری اصول ہے کہ رات کتنی ہی سیاہ اور دراز کیوں نہ ہو صبح ہوتی ہے اور ضرور ہوتی ہے۔

ہے افق سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر ❁ ٹوٹ کر مانندِ آئینہ بکھر جائے گی رات

❁.....❁.....❁

خاندان ٹوٹنے کے عمومی اسباب، نقصانات اوران کا نبوی حل

مولانا محمد اسامہ صدیقی نانوتوی❖

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالابتلاء بنایا ہے، اسی اعتبار سے اس کے لیے قوانین طے فرمائے ہیں، انہی قوانین میں سے ایک قانون قدرت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے انسانوں کو پریشانی میں پیدا کیا، پریشانیاں آنا انسانی زندگی کا ایک لازمہ ہیں، لیکن بر بنائے شفقت اللہ تعالیٰ نے ان تمام پریشانیوں کے حل بھی بہت کھول کھول کر قرآن وحدیث میں صراحتاً یا اشارۃً بیان فرمائے ہیں، اس لیے ان تمام کا حل بھی قرآن وحدیث ہی میں تلاش کرنا چاہیے، جب کہ عام مزاج یہ ہے کہ ہم اپنی پریشانیوں اور مسائل کا حل کبھی سیاسی لیڈروں کے پاس تلاش کر رہے ہوتے ہیں یا پھر ان تانترکوں کے پاس تلاش کرتے ہیں، جنہوں نے روحانی علاج کا نام دے دے کر لوگوں کو کھلے عام گمراہ کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے، یا اسی طرح میڈیا کے لوگوں کے پاس اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، جب کہ ان کے پاس ہمارے مسائل اور پریشانیوں کا حل نہیں ہے، وہ تو خود اپنی پریشانیوں کو بھی حل نہیں کر سکتے، تو پھر ہماری یا کسی اور کی پریشانیاں تو درکنار، ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ساری آیات اور احادیث مبارکہ میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مسائل کا حل قرآن واحادیث میں تلاش کرنے کی عادت ڈالو۔ بہت ساری قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تک یہ امت اپنے اندر جوڑ پیدا کرتی رہے گی تو بہت حد تک زوال کا شکار ہونے سے بچی رہے گی اور جب بھی اس میں توڑ پیدا ہوگا اور ایک دوسرے کے درپئے آزار رہیں گے، ذاتی مفاد اور نفسانی اغراض کی خاطر امت کو توڑتے رہیں گے، افراد سازی کے بجائے افراد شکنی کرتے رہیں گے، یعنی گھروں کو توڑیں گے، رشتہ داروں کو توڑیں گے، خاندانوں کو توڑیں گے تو پھر ایسے خاندانوں گھرانوں کا اللہ ہی مالک، ایسی قوم کو زوال پذیر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے، قرآن کریم

❖ جامعۃ الامام محمد قاسم النانوتوی، نانوتہ

نے ایسے لوگوں کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ ان کے زوال وخسران کی شہادت کے لیے کافی ہیں، خاندان توڑنے اور قطع رحمی کو فساد فی الارض کے برابر بتلایا ہے، ارشاد فرمایا:

الَّذِيْنَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيْثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِيْ الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ(۱)

ترجمہ: وہ جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں، اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ایسے ہی لوگ بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِيْ الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ، أُوْلَئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ(۲)

ترجمہ: پھر اگر تم نے منہ موڑا تو تم سے کیا توقع رکھی جائے؟ یہی کہ تم زمین میں فساد مچاؤ، اور اپنے خونی رشتے کاٹ ڈالو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، چنانچہ انہیں بہرا بنا دیا ہے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہ نے قطع رحمی اور فساد فی الارض کو ایک ساتھ جوڑ کر ذکر کیا ہے، پہلی آیت میں قطع رحمی کو مقدم رکھا اور فساد فی الارض کو مؤخر رکھا اور دوسری آیت میں فساد فی الارض کو مقدم اور قطع رحمی کو مؤخر رکھا، دونوں صورتوں میں قطع رحمی اور زمین میں فساد پھیلانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا ذکر کیا گیا ہے اور قطع رحمی کو فساد فی الارض کی اہم شکل بتایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اہل اسلام کے سوا دوسروں کو جہاں قرآن نے خاسر کہا ہے وہاں مراد کافر ہیں، اور اہل اسلام کے لیے جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد گنہگار ہیں، کیوں کہ ان لوگوں نے نفسانی خواہشوں اور دنیوی لذتوں میں پڑ کر رحمت خداوندی سے دوری اختیار کر لی، اس لیے خسارے کا لفظ استعمال کیا گیا۔

دوسری آیت سورہ محمد کی ہے جس میں فرمایا گیا کہ ''پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں''

---

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۷

(۲) سورہ محمد:۳۳

قطع رحمی سے متعلق احادیث مبارکہ

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ اسلام نے رشتہ داری اور قرابت کے حقوق پورے کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے، کیوں کہ قطع رحمی سے زمین میں فساد اور خرابیاں پھیلتی چلی جاتی ہیں اور فساد فی الارض کو اللہ تعالیٰ نے صراحتاً منع فرمایا، ارشاد عالی ہے: ﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ زمین میں فساد مچاتے مت پھرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل زمین میں ایک فساد برپا تھا، جس کی ایک اہم وجہ رشتہ داریوں کو توڑنا اور قطع رحمی تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جو کام کرائے ان میں ایک کام صلہ رحمی اور ناداروں کا بوجھ اٹھانے کا کرایا تھا، جس کے ذریعہ معاشرے میں جوڑ پیدا کرنے کی راہیں ہموار کی جارہی تھیں، صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ اور دوسرے اصحاب سے اس مضمون کی حدیث نقل کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص صلہ رحمی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے قریب کریں گے اور جو رشتہ داریوں کو قطع کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قطع کردیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اقرباء اور رشتہ داروں کے ساتھ اقوال وافعال اور مال کے خرچ کرنے میں حسن سلوک کرنے کا تاکیدی حکم ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ کوئی ایسا گناہ جس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی دیتا ہے اور آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے، ظلم اور قطع رحمی کے برابر نہیں۔(۱)

سیدنا حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہو کہ اس کی عمر زیادہ ہو اور رزق میں برکت ہو اس کو چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے، احادیث صحیحہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ قرابت کے حق کے معاملہ میں دوسری طرف سے برابری کا خیال نہ کرنا چاہیے، اگر دوسرا بھائی قطع تعلق اور ناروا سلوک بھی کرتا ہے جب بھی تمہیں حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے کہ یہی حسن اخلاق ہے۔

مذکورہ بالا آیت کا آخری ٹکڑا ہے، ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ﴾ یعنی ایسے آدمی جو زمین میں فساد پھیلائیں رشتوں اور قرابتوں کو قطع کریں ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

اسلام نے دو بھائیوں دو رشتوں، دو خاندانوں، دو گھرانوں اور دو عزیزوں کو باہم جڑ کر رہنے کی تاکید کی ہے، زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اس جڑاؤ میں اور آپس کے رشتہ ناطوں میں دراڑ نہ پڑنی چاہیے، اسلام نے تو ان اسباب پر بھی پہرا بٹھادیا جن اسباب کی وجہ سے آپسی رشتوں میں رخنہ پڑسکتا تھا، اسلام

(۱) ابوداؤد، والترمذی، بحوالہ ابن کثیر

کے بالمقابل ایک کافرانہ نظام ہے، جس کی قیادت ابلیس کررہا ہے، جس کی ہر ممکن یہ کوشش رہتی ہے کہ آپسی رشتہ داریاں باقی نہ رہیں، آپس میں توڑ پیدا ہو، گھر اور خاندان ٹوٹے، آپس میں حسد پیدا ہو، بغض اور عداوتیں پھیلیں، نفرتیں عام ہوں دلوں میں منافقت پیدا ہو اور چاروں طرف قطع رحمی ہو، انسانوں کو آپس میں لڑا کر وہ ان سے بدلہ لیتا ہے اور انسان سے اپنی ازلی دشمنی نکالتا ہے، ارشاد عالی ہے: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوّاً.

ترجمہ: شیطان تمہارا دشمن ہے، لہٰذا اس کو دشمن ہی بنا کر رکھنا۔

اب ہمارے سامنے دو نظام ہیں ایک نظام اسلام کا ہے، جس کے تحت کام کرنے والے حضرات کی ہر جگہ اور ہر وقت یہ کوشش رہے گی کہ کسی بھی حال میں زمین میں فساد برپا نہ ہو اور باہمی رشتوں کی بنیاد مضبوط ہو، ان میں کسی بھی حال میں رخنہ نہ پڑے، اس کے بالمقابل ایک نظام کفر کا ہے، جس کے تحت گزشتہ ڈیڑھ دو صدی میں حزب الشیطان کی ترجمانی کرنے والے چند ناہنجار قسم کے لوگ رہے ہیں، جنہوں نے حزب الشیطان کے لیے باقاعدہ مرکز بنا کر کام کیا، ایک برطانوی قوم کا شاہی خاندان اور دوسری قوم بنو اسرائیل ہے، انہوں نے ہر ممکن یہ کوشش کی ہے کہ کہیں بھی خاندانیت باقی نہ رہے، خاندانوں کا نظام ہی ختم ہو جائے، ذاتی اغراض اور مفاد پرستی کے ذریعہ مشرقی خاندانوں کو پارہ پارہ کر دیا جائے، جس طرح ان کے یہاں خاندانی نظام ٹوٹا ہوا ہے، بالکل اسی طرح کا نظام مشرقی ممالک میں بھی بنا دیا جائے، جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ نسل نو کا ایسا مزاج بنایا جس میں انانیت، خودغرضی، مفاد پرستی، جھوٹی شہرت اور مادیت ہی کو اپنی زندگی کی معراج سمجھے، جو جتنا جھوٹ بولے اور چالاکیاں کرے وہ اتنا ہی عزت مآب کہلائے، گویا کہ اہل باطل نے حق کے مقابلے میں باطل کے نظام کو انانیت، خودغرضی، مفاد پرستی جھوٹی شہرت اور مادیت کا سنہرا ورق لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور لوگ اپنی کم علمی، اپنی تاریخ اور اپنے اسلاف سے قطع تعلق کی وجہ سے ان کے جھانسے میں آتے چلے گئے، تمام شیاطین کا یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ باطل کو خوبصورت الفاظ میں پیش کرتے ہیں، ایسا مزین بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اس کی گندگی کی طرف لوگوں کا ذہن بھی نہ جائے، ارشاد عالی ہے: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوّاً شَيَاطِينَ الإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوراً

ترجمہ: (جس طرح یہ لوگ ہمارے نبی سے دشمنی کررہے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جو دھوکا دینے کی

خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے تھے۔

اس مزاج کے پنپنے کی وجہ سے جو نقصان ہوا اس کی تلافی لاکھ کوششوں کے باوجود ممکن نہیں ہو پا رہی ہے، ہمارے گھر کیوں ٹوٹ رہے ہیں اس کے کیا کیا اسباب ہیں آیئے ان کے بارے میں چند باتیں ذکر کرتے ہیں۔

فطرتاً کوئی نہیں چاہتا ہے کہ وہ اپنے ماں جاؤں سے الگ تھلگ ہوکر زندگی بسر کرے، کیوں کہ اس کے اندر فطری طور پر الفت اور انسیت رکھ دی گئی ہے، اس کی طبیعت فطرتاً آمادہ نہیں ہوتی کہ وہ سب سے کٹ کر اور الگ تھلگ ہوکر زندگی بسر کرے۔ انسان کو گھر چاہیے، بیوی بچے چاہئیں بھائی بہن چاہئیں، پھر ماں باپ بھی ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے آپس میں قطع تعلق کر کے ایک دوسرے سے بے خبر رہیں، پھر بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ خاندان ٹوٹ رہے ہیں، سگے بھائی ایک دوسرے کی صورتوں سے بیزار ہو رہے ہیں۔

مادیت کی یلغار کی زد میں سب سے زیادہ وہ لوگ آئے ہیں جن کی اسلامی اور دینی تربیت نہیں ہوسکی، جن کا مزاج ایثار کے بجائے خودغرضی اور مفاد پرستی کا بنا، نیتوں میں فتور آیا اور اتنی صلاحیت بھی باقی نہ رہی کہ مزاج کے خلاف کوئی ناگوار بات ہی برداشت کرلیں، یعنی تحمل اور قوت برداشت کا فقدان ہوگیا، جس کی وجہ سے وہ نقصانات ہوئے جن کی تلافی ممکن نہیں ہو پا رہی ہے۔

گھر جو ٹوٹتے ہیں، اس کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں، سردست ان تین اسباب کا ذکر کرنا قرین قیاس ہے جن کی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک دعا میں اشارہ فرمایا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سکھلائی ”**اللهم إني أعوذبك من امرأة تشيبني قبل المشيب، ومن مال يكون علي عذابا، ومن ولد يكون علي وبالاً**“

ترجمہ: اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں آپ کی ایسی عورت (بیوی سے) جو مجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا بنا دے، اور ایسے مال سے جو میرے لیے عذاب بن جائے اور ایسی اولاد سے جو میرے لیے وبال بن جائے۔

اس حدیث پاک میں تین سبب خاندان ٹوٹنے کے ذکر کیے گئے ہیں، زیادہ تر ان ہی تین اسباب کی وجہ سے گھرانوں، نامور خاندانوں میں رخنے پڑتے ہیں، جن خاندانوں کی شرافت کی مثالیں دی جاتی تھیں اور ان کے اتحاد کے چرچے زبان زد تھے، آج وہ کورٹ کچہریوں میں کھڑے ہوکر اپنے ہی بھائی کو مجرم

ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں، اور وجہ صرف اور صرف وہی ہے کہ مزاجوں میں نخوت، تکبر، انانیت، خودغرضی اور مفاد پرستی جیسی مذموم صفات درکرگئی ہیں، جس کی ایک اہم وجہ تربیت اسلامی کا فقدان اور وہ نظام تعلیم ہے جس کے پیچھے ہمارے گھرانے پاگلوں کی طرح بھاگ رہے ہیں۔

بہرحال ان تین اسباب میں پہلا سبب ہے مادی اشیاء، سستے لالچ، اقتدار زمین اور جائیداد وغیرہ ہیں جن کو حدیث میں مال سے تعبیر کیا گیا، غیر تربیت یافتہ حضرات اس مرحلے ہی میں مال اور مادی چیزوں میں الجھ کر اپنے گھرانوں کو، اپنے بھائیوں کو، اپنے عزیز واقارب کو، اپنے خاندانوں کو پارہ پارہ کرلیتے ہیں، یہ ہمارے معاشرہ کے وہ لوگ ہیں جو غیر منظّم اور بے سوچے سمجھے زندگی گزارنے کے عادی ہیں، یہ سب کچھ کرنے کے مجاز ہوجاتے ہیں اور ہر طرح کی حدود وقیود سے آزاد ہوکر زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم نے ارشاد فرمایا: ﴿وَحَسِبُوْا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا ہم جو چاہے کرلیں۔

یہ آیت گرچہ یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی، مگر فی الحال امت محمدیہ کا زیادہ تر طبقہ اس کا مصداق بنا ہوا ہے، کہ وہ جو چاہے کرنے کا عادی ہوگیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بے وزن اور بے حیثیت زندگی گزار رہے ہیں، ایسے لوگوں کی نہ گھر میں حیثیت ہوتی ہے اور نہ ہی باہر، یہ وہ لوگ ہیں جو مادیت کی بنیاد پر اپنے گھر والوں بھائیوں اور بہنوں کو پہلے ہی مرحلے میں توڑ لیتے ہیں، اور زندگی بھر اس کے نتائج بد سے تھک ہار کر بے نام ونشان ہوجایا کرتے ہیں یا نشان عبرت بن جاتے ہیں۔

اگر خوش قسمتی سے یہ مرحلہ بغیر گھر ٹوٹے گزر جاتا ہے اور مادی چیزوں پر نظر نہ کرکے جذبۂ ایثار کے ساتھ اپنی قوت جامعہ کو بچانے میں کسی خاندان کے لوگ کامیاب ہوجاتے ہیں، تو اب دوسرا مرحلہ آتا ہے، جس میں اکثر وبیشتر لوگ اپنے بھائی بہنوں کو توڑ لیتے ہیں، اور وہ مرحلہ ہے جب اس گھر میں مختلف تہذیب وثقافت اور الگ الگ مزاجوں کی خواتین آتی ہیں، وہ آکر گھر کے نظام کو یکسر بدلنے کی کوشش کرتی ہیں، ہر ایک یہ چاہتی ہے کہ اس گھر کا نظام میرے مطابق چلے، اس وقت مرد حضرات اکثر وبیشتر اپنا کردار اپنی محنتیں، اپنے گھر کے اصول، اپنے والدین کے مجاہدے اور ان کی ریاضتوں کو نظر انداز کرکے ان خواتین کی جائز ونائز خواہشات کی تکمیل کے لیے کچھ اقدام ایسے کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے گھر اور خاندان کی قوت جامعہ پارہ پارہ ہوجاتی ہے، جو لوگ پہلے مرحلے میں اپنی قوت جامعہ کو پارہ پارہ ہونے سے بچالے جاتے ہیں، وہ لوگ اکثر وبیشتر اس مرحلے میں عورتوں کی سازشوں کا شکار ہوکر ٹوٹ جاتے ہیں، جس کے دنیوی

واخروی نقصانات لامتناہی ہیں۔

آج ہمارا معاشرہ جس بدحالی کا شکار ہے اور نسل نو بے مہار اونٹ کی طرح پروان چڑھ رہی اور اس پر کسی کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے گھرانوں کو خاندانوں کو توڑ رکھا ہے، ظاہر بات ہے کہ جب گھروں میں خاندانوں میں کوئی اچھا یا برا کہنے والا باقی نہیں رہے گا تو اگلی نسل قبل از وقت سیاہ سفید کی مالک بن بیٹھے گی، سیاہ سفید کے مالک بن کر پھر بیوی بچے اس شخص کا پاگل بنائیں گے جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے عمل سے یہ باور کرایا کہ وہ اپنے خاندان میں تنہا ہے، ایسے نتائج اس لیے سامنے آئے کہ اس نے آنکھ بند کر کے اپنی بیوی کی بات پر امنا وصدقنا کہا۔ ایک حدیث میں قرب قیامت کی یہ نشانی بیان فرمائی ہے کہ "أطاعَ الرجل زوجته وعق أمه"، مرد اپنی بیوی کی بات مانے گا اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا، قیامت سے قبل ایسا ہوگا اور آج یہ ہو رہا ہے۔

اس کا یہ مفہوم نہ سمجھا جائے کہ اپنی بیویوں کے حقوق پامال کیے جانے لگیں، اس کی ہرگز اجازت نہیں، بات ہو رہی ہے عمومی حالات کی جن بنیادوں پر عام طور پر اچھے اچھے خاندانوں اور بڑے بڑے گھرانوں کی ثقافت اور تہذیب پامال ہو رہی ہے، ان کی قدروں کا جنازہ نکل رہا ہے، اس کی وجہ وہی ہے کہ جو مائیں گھروں کو، خاندانوں کو عزیز واقارب کو جوڑتی تھیں، جو اپنی نسلوں کو بڑوں کا احترام سکھاتی تھیں، اپنے خاندانوں کے بڑوں کو اپنی بے لوث خدمت کے ذریعہ اپنا گرویدہ بناتی تھیں، آج ان ماؤں کی زندگی کے مقاصد بدل گئے، نیتوں میں فرق آ گیا، مزاجوں میں خدمت کے بجائے خود غرضی آ گئی، ان کی ترجیحات بدل گئیں، معنوی نظام کے بجائے ظاہری چمک دمک ان کو مرعوب کرنے لگی، اپنے کرداروں کو بھول گئیں، سیدھی سچی زندگی کے بجائے جھوٹ، فریب چرب لسانی اور چالاکی کا نام عقلمندی رکھ دیا گیا ہے، اسی کو ترقی کا معیار سمجھ بیٹھیں، بقول حفیظ جالندھری:

کفران نعمت کی سزا پائی
عمل جیسے کیے، ویسی درحق سے جزا پائی

بہرحال یہ دوسرا مرحلہ ہے جہاں لوگ عام طور پر اپنے گھرانوں اور خاندان کو توڑ لیتے ہیں، بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں وہ حضرات جو اپنے آپ کو، اپنے گھرانے کو (یعنی گھرانے کی قدروں) اور اپنے خاندان کو ان دونوں مراحل سے بعافیت وسلامت گزار لے جاتے ہیں اور مادیت اور عورتوں کے فتنوں کا شکار نہیں ہوتے۔

جوحضرات اپنے آپ کوان دونوں مرحلوں میں بعافیت بچالے جاتے ہیں اور کسی بھی حال میں اپنے گھرانے کی قدروں پر آنچ نہیں آنے دیتے، ان حضرات کے سامنے ابھی ایک اور مرحلہ آتا ہے جو سابقہ دونوں مرحلوں سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔

اور وہ مرحلہ ہے اولاد کا، یعنی اولاد کے مفادات اور ان کے کہنے میں آکر لوگ اپنی خاندانی روایات کا جنازہ نکال دیتے ہیں، بلکہ اپنے آپ ہی میں شکوے شکایات، بداعتمادیاں اور بدظنیاں پیدا کرنے لگتے ہیں، عام طور پر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ اولاد کے ہاتھوں مجبور ہوکر بڑے بڑے گھرانے تباہ ہوگئے، بڑے بڑے نظام ختم ہوگئے، ہر گھر عام طور پر ان تینوں مراحل کی زد میں آتا ہے اور اکثر وبیشتر لوگ ان تین موقعوں پر فتنوں کا شکار ہوجاتے ہیں، جو گھرانہ بھی ان فتنوں کا شکار ہوگیا، چاہے اس نے مادی چیزوں کی وجہ سے اپنی قوت جامعہ کو ختم کیا، بیویوں کے کہنے میں آکر اپنے گھریلو نظام کو توڑا ہو، یا پھر اولاد کے کہنے میں اپنے سگے بھائیوں سے بداعتمادیاں پیدا کرلیں، تو اس نے اپنی بنیادوں کو متزلزل کردیا، جس کا نقصان نہ صرف اس کو خود ہوتا ہے، سب سے زیادہ نقصان اگلی نسلوں کو ہوتا چلا جاتا ہے۔

آج انسانی معاشرے سب سے زیادہ کرب کا شکار ہیں، سکون میسر نہیں، اجتماعیت مفقود ہے، لوگ من چاہی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوگئے ہیں، اور اس تنہائی پسند آزادی کو ترقی کا نام دے کر انسانوں کو انسانوں ہی سے، گھر والوں کو گھر والوں ہی سے، عزیز واقارب کو رشتہ داروں سے، بلکہ سگے بھائی بہنوں کو سگے بھائی بہنوں ہی سے کاٹا جارہا ہے، عام طور پر کوئی بھی گھرانہ ان تینوں مراحل میں سے کسی ایک مرحلے پر آکر ٹوٹ ہی جاتا ہے، جس کے نقصانات صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔

چوں کہ مغربی تعلیم نے ہمارے معاشرہ کا ایک مخصوص مزاج بنا کر کھڑا کیا اور خاندان اور خاندانی نظام کو بالکلیہ توڑنے کی مذموم کوشش کی اور اچھی خاصی حد تک اس میں کامیابی بھی ان کو ان کے گمان کے مطابق مل گئی ہے، مگر خاندان کے ٹوٹنے اور اجتماعی خاندان کے ختم ہونے کے جو نقصانات اور خرابیاں سامنے آئیں، تو اب اس کی تلافی چاہ کر بھی ممکن نہیں ہو پارہی ہیں، عام طور پر کوئی کسی کا پرسان حال نہیں، بقول شخصے:

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی

اسے لگتا ہے کہ وہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کررہے ہیں، بیٹا باپ کے جنازے کو کندھا دیتے ہوئے ڈر رہا ہے، یہ سب نتائج اس لیے سامنے آئے کہ خاندانیت باقی نہ رہی، جہاں خاندانیت باقی تھی

وہاں یہ سب خرابیاں نہیں آسکیں۔

انسان کی زندگی میں یہی وہ تین مراحل اور مواقع آتے ہیں، جو بہت اہم ہیں اور جن میں انسان کو بہت غیور ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، جو حضرات ان تین موقعوں پر چوک جاتے ہیں وہ اپنے وجود کو کالعدم کر لیتے ہیں، اور جو لوگ ان مواقع پر مستقیم ہوجاتے ہیں ان کے وجود کو نہ صرف خاندان والے بلکہ دوسرے بھی تسلیم کرتے ہیں۔

بقول علامہ اقبال:

نہ رہ اپنوں سے بے پرواہ اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے تجھ کو دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

حدیث پاک میں تینوں مراحل کا تقدیم وتاخیر کے ساتھ تذکرہ کیا گیا اور ان تینوں مراحل کی شدت حساسیت کو بتادیا گیا کہ ان تینوں مراحل میں سوائے اللہ رب العزت کی پناہ میں آنے کے کسی کے پاس کوئی چارہ نہیں، اللہ رب العزت ہمیں ان تینوں مراحل کی حساسیت کا صحیح شعور نصیب فرمائے، اور اپنے خاندانی رشتوں کے سلسلے میں غیور بنائے، تمام ہی قارئین سے گزارش ہے کہ اس مادیت پسند معاشرے میں روزانہ معمولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جامع ترین دعا کا اہتمام کریں، کلمات نبوی کے اہتمام کی برکات سے اللہ تعالیٰ آپ کے خاندانوں کو باہمی پھوٹ اور ٹوٹنے سے بچائے گا، ان شاء اللہ۔

"وما ذلك على الله بعزيز

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله وصحبه أجمعين

برحمتك يا أرحم الراحمين".

الحاد وارتداد کی جانب بڑھتا ہوا قدم

مولانا محمد اسجد عقابی ❖

عالم اسلام کے نامور مفکرین و مدبرین اور اکابرین کی رائے ہے کہ موجودہ وقت میں مسلمانوں میں چند اہم اور بنیادی مسائل میں سے اہم یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں میں الحاد وارتداد کی لہر بہت تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔ پہلے تو ہم اس بات کے شاکی تھے کہ مروجہ مغربی تہذیب اور طرز تعلیم ہمارے نوجوانوں کے دین سے دوری کا سبب ہے، اور انیسویں اور بیسویں صدی کے اہم مفکرین نے اس جانب خاطر خواہ اقدامات بھی کئے ہیں اور مغربی فلسفہ اور طرز تعلیم کا جو طوفان بلا خیز آیا تھا اس کی روک تھام اور اس کے اثرات سے مسلم قوم کو بچانے کے لئے کتابیں تصنیف فرمائیں اور ان کے سموم باطلہ سے عوام کو آگاہ کیا ہے۔ ان اکابرین نے اسلامی عقائد ومسائل اور دیگر اختلافی اور ذہنی ہیجان پیدا کرنے والے مسائل کو مکمل طور پر منقح ومجلی کر کے بیان کیا ہے۔ کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس میں کوئی تشنگی باقی رہے لیکن ہماری قوم کا المیہ ہے کہ ہم اپنے اکابرین واسلاف کی قربانیوں کو محفوظ کرنے کرنے میں بخیل واقع ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی تشہیر وترویج اور عوام الناس تک خصوصا علوم عصریہ سے وابستہ افراد تک جس تیزی اور جس انداز میں ان کتابوں کو پہنچنا چاہئے تھا، ہم اس کام کو انجام دینے سے عاجز وقاصر رہے ہیں۔ لیکن اس کمی وکوتاہی کے باوجود اسلامی شناخت اور اسلامی تعلیمات کا عام رواج قائم رہا اور دین حنیف کی جانب لوگ مائل ہوتے رہے ہیں لیکن بحیثیت مسلمان ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام ایک مکمل اور کامل دین ہے، اس میں کسی طرح کی کمی وزیادتی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اسی لئے اللہ تعالی نے مذہب اسلام کی اساس قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے اور احادیث مبارکہ کی حفاظت وصیانت کے لئے ایسے نادر ونایاب انسانوں کو پیدا فرمایا جنہوں نے تدوین حدیث کے لئے محیر العقول کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ائمہ احادیث اور ائمہ اسماء رجال کے حالات زندگی ہمیں بتاتے ہیں کہ ان حضرات نے علم حدیث کے مختلف گوشوں کو اس طور پر منضبط کر دیا ہے کہ اس تمام احادیث اب تک اپنی اصل حالت میں برقرار ہے۔ اللہ تعالی نے یہ انتظام اس لئے کرایا کیونکہ اب کوئی دین آنے والا نہیں ہے اور یہ آخری دین ہے اس لئے اس کی صحیح تعلیمات کا باقی رہنا ضروری ہے۔ آج اسلامی تعلیمات اپنی تمام تر کشش اور حقانیت کے باوجود اجنبی اور غیر مانوس ہوتی جارہی ہے، اور اسلامی تعلیمات سے دوری برتنے والے اور اس کے منصوص مسائل میں

❖ استاذ دار العلوم وقف دیوبند

تخفیف پیدا کرنے کی کوشش کرنے والے وہ افراد ہیں جنہیں بادی النظر میں قوم کا اشرافیہ تصور کیا جاتا ہے۔

مذہب اسلام میں سب سے عظیم ترین گناہ شرک کو قرار دیا گیا ہے، بلکہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے" : یقیناً اللہ اس بات کو معاف نہیں کرین گے کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہیں، معاف فرمادیں گے، اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ حق سے دور جا پڑا"۔ مذکورہ آیت میں اس بات کی صراحت ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے جس کی بخشش نہیں ہوگی اور شرک کرنے والے ہمیشہ اللہ تعالی کی رحمت سے دور رہیں گے۔ علاوہ ازیں، احادیث مبارکہ میں جگہ جگہ رسول اکرم ? نے شرک کی قباحت اور اس کی ہولنا کی سے امت کو متنبہ کیا ہے اور اس سے دور رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ شرک کی ایک قسم تو واضح ہے کہ خدا کی ذات میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، یعنی خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت و پرستش کرنا اور اس سے مرادیں مانگنا۔ دوسری قسم شرک فی الصفات ہیں، یعنی کسی انسان یا دیگر مخلوق کے متعلق عقیدہ رکھنا کہ فلاں سے فلاں کام ہوجائے گا۔ یہ تو وہ اقسام ہیں جو ظاہر ہیں لیکن شرک کی باریکی اور سنگینی بہت پیچیدگی رکھتی ہے۔ ایسے تمام اعمال جو اسلامی روح کے منافی ہے اور جو کسی طور اللہ تعالی کی ربوبیت میں کسی اور کو شریک کرنے کا مدعی ہو وہ شرک کی تعریف میں شامل ہے۔

اب ہمیں یہ سمجھنا ہوگا اور سوچنا ہوگا کہ جب شرک کی اس قدر ممانعت بیان کی گئی ہے تو ہمیں کس طرح ایسے اعمال وافعال سے دور رہنا ہے۔ جس طرح بقائے ایمان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی محبت ضروری ہے ٹھیک اسی طرح کفر وشرک سے نفرت بھی ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان ان دونوں چیزوں کو اپنے قلوب میں سمائے رکھے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ایسی کتابوں کا مطالعہ کریں اور ایسے علما کرام کے بیانات سے مستفید ہونے کی کوشش کریں جو عقائد کے باب میں ہماری راہنمائی کا ذریعہ بنیں، نیز ایسے عناصر جو عقائد اور دین سے سمجھوتے تک پہنچائے، خواہ وہ تعلیمی میدان سے ہو، عملی میدان سے ہو، سیاسی یا نام نہاد اصلاحی میدان سے ہو، ضروری ہے کہ ایسے کاموں اور ایسے اعمال سے دور رہا جائے۔ ہم لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مذہب اسلام محض چند باتوں پر محیط کوئی ناقص یا ادھورا دین نہیں ہے بلکہ یہ خدائی دین ہے جو مکمل ضابطہ حیات ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں مذہب اسلام نے مکمل راہنمائی نہیں فرمائی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی تہذیب وثقافت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ تہذیب وثقافت اور رسم ورواج کے اعتبار سے مذہب اسلام کسی دوسری تہذیب یا رواج یا محتاج نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ ماضی میں ہمارے اسلاف واکابرین نے اسلامی تعلیمات سمیت اسلامی شناخت اور تہذیب وثقافت پر بھی قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں اور شاہان اسلام نے اس جانب خصوصی پیش رفت فرمائی تھی۔ لیکن آج بعض ناعاقبت اندیش اور عدم علم کی بنا پر مذہب اسلام کی تہذیب کو دوسری تہذیب کے ساتھ اس طور پر مدغم کرنے کو بے چین و بے قرار ہے کہ ہماری اپنی اصل شناخت کہیں گم ہوکر رہ جائے۔ ضروری ہے کہ ہم ایسے افعال واعمال سے اجتناب برتیں جو ہمیں اسلامی تعلیمات اور شناخت سے دور کرے۔ اللہ تعالی ہمیں دین مستقیم پر گامزن رکھے۔

قسط (۱)

بیع المعدوم کا تجزیاتی مطالعہ

مولانا عصمت اللہ نظامانی ❖

اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے۔اس نے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی دنیاوی اور اخروی فلاح وکامیابی کے ذرائع اور طریقے بیان کردیئے ہیں، اور روزِ محشر تک انسان کو پیش آنے والے نت نئے مسائل، اور عہد بہ عہد پیدا نے ہونے والے تمام حوادث کا اصولی اور اجمالی حل قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ میں بیان کردیا گیا ہے۔جنہیں فقہائے کرام اور ائمہ مجتہدین نے اپنی کوششوں وکاوشوں کے ذریعے اور اجتہادی صلاحیت بروئے کار لاتے ہوئے کافی تفصیل ووضاحت کے ساتھ مرتب ومدوّن کرکے امت کے سامنے پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی جہود وخدمات اور مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف واقرار موافقین ومخالفین سب کو ہے۔بلاشبہ انہوں نے اپنی علمی ذمہ داری احسن طریقے سے انجام دی، اور امت کی رہنمائی کے لیے ناقابلِ شمار کتابوں کا ذخیرہ اور علمی خزانہ اپنے پیچھے چھوڑا۔تاہم اس بات سے انکار کرنا بھی دانشمندی نہیں کہ وقت گزرنے اور زمانہ بدلنے سے نوازل وحوادث کی صورت میں طرح طرح کے جدید مسائل وقوع پذیر ہوئے ہیں جن سے متعلق ہمارے فقہائے کرام کے کلام میں تصریح نہیں ملتی، یا امت میں وہ مسائل اتنے زیادہ رائج ہوچکے ہیں کہ حضراتِ ائمہ کرام کے بیان کردہ اجتہادی احکام پر عمل کرنے سے امت کے ایک بڑے طبقے کو مشکلات اور ذہنی انتشار کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف اہل علم کی ایک بڑی جماعت نے وقت کے علماء وفقہاء کو اس بات کی ترغیب وتاکید کی ہے کہ تجارتی معاملات، عقود مالیہ اور دیگر معاشی مسائل میں شریعت کے مقررہ دائرے کے تحت جہاں تک ہوسکے امت کے لیے آسانی وسہولت پیدا کی جائے۔چنانچہ اس سلسلے میں فقہائے احناف اور بالخصوص متاخرین نے اس بات کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔یہاں تک بعض اکابرین نے زیادہ رائج وقوع پذیر معاملات میں مذہبِ غیر پر عمل کرنے کی بھی گنجائش دی ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی

❖ استاذ جامعہ دارالعلوم، کراچی

تھانویؒ صاحب نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اس کی اجازت نقل کی ہے، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

میں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا تھا کہ اگر کثیرۃ الوقوع معاملات پر دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتوی دیا جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟ حضرت نے فرمایا تھا کہ کوئی حرج نہیں۔(۱)

نیز حکیم الامت آگے فرماتے ہیں: اگر تجارت پیشہ وزراعت پیشہ، ملازمت، اہل صنعت وحرفت، یہ سب ان چیزوں کے متعلق واقعات بصورتِ استفتاء جمع کر کے دے دیتے تو میں سوال وجواب کی صورت میں ان کے احکام جمع کر دیتا، اگر کسی مسئلے میں امام ابوحنیفہ کے مذہب پر جواز نہ نکلتا تو میں نے طے کیا تھا کہ امام شافعی کے مذہب پر فتوی دے دوں گا۔ امام مالک کے مذہب پر فتوی دے دوں گا۔ امام احمد بن حنبل کے مذہب پر فتوی دے دوں گا۔ اور اگر ان سے بھی کوئی صورت نہ نکلے گی تو اس کی سہل صورت بتلاؤں گا کہ یوں کرلیا کرو، جس سے جواز نکل آتا۔(۲)

اسی طرح حضرت تھانویؒ نے مالی معاملات کے کئی مسائل میں امت کی آسانی کے پیشِ نظر مذہبِ غیر پر فتوی دیا ہے۔ چنانچہ بیعِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کے مقرر وقت تک بازار میں موجود نہ ہونے (۳)، نیز بیعِ سلم میں کم از کم مدت متعین نہ ہونے کے سلسلے میں امام شافعیؒ کے قول پر فتوی دیا۔(۴) جانور پالنے کے لیے نصف حصے پر دینے کے جواز میں امام احمد وغیرہ کے قول پر عمل کرنے کی اجازت دی۔(۵)

ذکر کردہ مسائل کے شرعی حکم سے قطعِ نظر، صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت تھانویؒ عقودِ مالیہ اور معاملات میں حتی الامکان سہولت اور آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا یوسف بنوریؒ تحریر فرماتے ہیں: اگر مسئلہ مطلوبہ سب فقہاء کے ہاں ملتا ہے، لیکن حنفی مذہب میں دشواری اور بقیہ مذاہب میں نسبتاً سہولت ہے، اور عوام کا عام ابتلاء ہے تو اخلاص کے ساتھ جماعت اہلِ علم غور کرے۔ ان کو یقین ہو جائے کہ عمومِ بلوی کے پیشِ نظر عصرِ حاضر میں دینی تقاضا سہولت وآسانی کا مقتضی ہے تو پھر مذہبِ مالک، مذہبِ شافعی، مذہبِ احمد بن حنبل کو علی الترتیب اختیار کر کے اور اس پر فتوی دیکر فیصلہ کیا جائے۔

آگے لکھتے ہیں: مثلاً مسائلِ معاملات میں بیع قبل القبض ہے کہ آج کل تمام تاجر طبقہ اس میں

---

(۱) تھانوی، مولانا محمد اشرف علی، ملفوظات حکیم الامت، ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط۱۴۲۴ھ (۶/۲۱۵)

(۲) أیضاً۔ ملفوظ نمبر ۲۲۶ (۳) ایضاً، ۳/۲۱ (۴) ایضاً، ۳/۳۴۳

(۵) تھانوی، مولانا محمد اشرف علی، امداد الفتاوی، ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، ط۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰م (۳/۱۰۶)

مبتلا ہے۔ اب اس کی صورتِ حال پر غور کر کے پوری طرح جائزہ لیا جائے کہ اگر یہ ابتلاء واقعی ہے اور موجودہ معاشرہ مضطر ہے، اور بغیر اس کے چارہ کار نہیں تو مذہبِ مالکی پر فتوی دے دیا جائے کہ عدمِ جواز بیع قبل القبض مطعومات کے ساتھ مخصوص ہے۔ (۱)

بیع قبل القبض سے متعلق بیان کردہ حکم سے صرف نظر، محض یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ کثیر الوقوع مالی معاملات میں آسانی پیدا کرنے کی حضرت بنوریؒ نے بھی ترغیب دی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے علماء دیوبند تقریباً سب اس بات پر متفق رہے ہیں کہ تجارتی معاملات میں جہاں کاروبار کی ضرورت داعی ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ (۲)

اسی طرح متاخرین احناف میں سے متعدد حضرات نے اس بات کی ترغیب وتاکید کی ہے کہ مالی معاملات میں جہاں تک ممکن ہو، شریعت کے مقرر کردہ اصول کے اندر رہ کر امت کے لیے سہولت پیدا کی جائے۔ دورِ حاضر میں رائج مالی عقود میں ایک ''بیع المعدوم'' ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالے میں ''بیع المعدوم'' کی شرعی حیثیت، اس سے متعلق فقہائے کرام کے اقوال ودلائل اور دیگر اصولی مباحث ذکر کرنے کے ساتھ اس بات کا تجزیہ بھی پیش کیا جائے گا کہ فقہائے کرام کے کلام سے کس حد تک اس میں سہولت وآسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

مقالے کی ترتیب یہ ہوگی کہ بیع المعدوم کی تعریف ومفہوم اور قواعد واصول بیان کیےجائیں گے، پھر اس کے جواز وعدم جواز میں فقہاء واہلِ علم کے اقوال ودلائل، اور پھر بیع المعدوم کی رائج جائز صورتوں کا ذکر ہوگا، بعد ازاں خاتمہ البحث پر مقالے کا اختتام کیا جائے گا۔

بیع المعدوم کی تعریف

لفظِ معدوم، عدم سے مشتق ہے، اور یہ موجود کا ضد ہے۔ اس کے معنی ناپید، گم یا مفقود ہونے کے ہیں اور جس لفظ میں ''عدم'' مادہ پایا جائے گا، اس میں ختم اور ناپید ہونے کا مفہوم بھی پایا جائے گا جیسا کہ ابن فارس لکھتے ہیں: **(عدم) العين والدال والميم أصل واحد يدل على فقدان الشيء وذهابه.** (۳)

---

(۱) بنوری، مولانا محمد یوسف، بصائر وعبر، ناشر: مکتبہ بینات، کراچی ۱/۲۵۴

(۲) عثمانی، مفتی محمد تقی، یادیں، قسط: ۵۶، البلاغ، ذی الحجہ ۱۴۴۳ھ

(۳) ابن فارس، أحمد بن فارس القزويني (ت ۳۹۵ھ)، معجم مقاييس اللغة، تحقيق: عبدالسلام محمد ہارون، الناشر: دارالفکر - بیروت، ط ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹م، مادة: عدم، ۴/۲۴۸

اور ابن منظور تحریر فرماتے ہیں: **عدم: العدم والعدم والعدم: فقدان الشیء وذهابه، وغلب علی فقد المال وقلته.(۱)**

اور اصطلاحاً بوقت عقد غیر موجود چیز کی خرید وفروخت کو بیع المعدوم کہتے ہیں۔

معدوم کی اقسام

معدوم کی مختلف اعتبار سے تقسیم کی جاتی ہے، کبھی حکم کے اعتبار سے تو بسا اوقات وجود کے اعتبار سے۔ ذیل میں معدوم کی معروف اقسام ذکر کی جاتی ہیں۔

۱- معدومِ حقیقی: وہ چیز ہے جس کا خارج میں وجود نہ ہو۔ مثلاً: عقدِ بیع کرتے وقت مبیع کا حسی طور پر موجود نہ ہونا۔

۲- معدوم حکمی: وہ ہے جس کا خارجی وجود ہو، لیکن شریعت میں اس پر "عدم" کا حکم لگایا ہو۔ مثلاً: کسی شخص کے پاس وضو کرنے کے لیے پانی موجود نہ ہو، جبکہ اس کے ساتھی کے پاس موجود ہو، لیکن پہلا شخص اس کے خریدنے پر قادر نہ ہو تو ایسی صورت میں پانی حقیقی طور پر اگرچہ موجود ہے، لیکن حکماً موجود نہیں کہ شریعت نے اس پر "عدم" کا حکم لگایا ہے۔ چنانچہ معجم لغۃ الفقہاء میں معدوم حقیقی کے بارے میں لکھتے ہیں": الذی لیس لہ صورۃ فی الخارج"، اور معدومِ حکمی کے بارے میں لکھا ہے: **الذی حکم الشرع بعدمه وإن کانت له صورة فی الخارج".(۲)**

۳- معدوم عرفی: وہ چیز ہے جس کا خارج میں وجود ہو، لیکن عرف عام میں اسے غیر موجود سمجھا جاتا ہو۔ جیسے پھل کے اندر موجود گٹھلیوں کی بیع۔ اس کا وجود ہوتا ہے، لیکن عرف میں انہیں معدوم سمجھا جاتا ہے، چنانچہ علامہ سراج الدین ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

وإنما لا یجوز بیع ما فی هذا القطن من الحب وما فی هذا الثمر من النوی لأن کلاً منهما معدوم عرفًا، إذ لا یقال: هذا نوی فی ثمرة ولا حب فی قطنة.(۳)

ترجمہ: روئی میں موجود دانے کی بیع، اور پھل میں موجود گٹھلی کی بیع جائز نہیں؛ کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک عرفاً معدوم ہے؛ کیونکہ اس طرح نہیں کہا جاتا کہ یہ پھل میں موجود گٹھلی ہے، اور روئی کے اندر موجود دانے ہیں۔

---

(۱) ابن منظور، محمد بن مکرم الإفریقی (ت ۷۱۱ھ)، لسان العرب، الناشر: دار صادر - بیروت، ط۳: ۱۴۱۴ھ، ۱۲/۳۹۲

(۲) قلعجی محمد رواس - وقنیبی حامد صادق، معجم لغۃ الفقہاء، الناشر: دار النفائس للطباعة والنشر، ط۲: ۱۴۰۸ھ، ۱۹۸۸م، ص۴۴۰

(۳) ابن نجیم، سراج الدین عمر بن ابراہیم (ت ۱۰۰۵ھ)، النہر الفائق شرح کنز الدقائق، تحقیق: أحمد عزو عنایة، الناشر: دار الکتب العلمیة - بیروت، ط۱: ۱۴۲۲ھ، ۲۰۰۲م، ۳/۳۶۱

۴-معدوم مطلق: وہ ہے جس کا کسی طور پر ثبوت اور وجود نہ ہو۔ نہ وجود خارجی ہو، اور نہ ہی وجودِ ذہنی ہو۔(۱) اور اس چوتھی قسم سے مناطقہ وغیرہ بحث کرتے ہیں۔ فقہائے کرام صرف پہلی تین اقسام کا ذکر کرتے ہیں۔

معدوم سے متعلق چند قواعد

۱-المعدوم قد یعتبر موجودا حکماً.(۲)

یعنی معدوم بسا اوقات حکمی طور پر موجود مانا جاتا ہے۔

علامہ بابرتی نے "عنایہ" میں اس کی مثال ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ اگر ذبح کرنے والا بوقت ذبح تسمیہ بھول گیا تو حکماً اسے موجود مانا جائے گا اور جانور وغیرہ حلال ہوگا۔ اسی طرح آرڈر پر لی ہوئی چیز بوقتِ عقد معدوم ہوتی ہے، لیکن حکماً اسے موجود سمجھا جائے گا۔(۳)

۲-المعدوم شرعا کالمعدوم حساً(۴)

یعنی شرعاً معدوم چیز حسّی طور پر معدوم کی طرح ہے۔

اس قاعدے کا مفہوم واضح ہے کہ جس چیز کا شریعت نے اعتبار نہیں کیا، وہ حکماً معدوم ہوتی ہے، اگرچہ ظاہری اور حسی طور پر موجود ہو، لیکن اس پر کوئی حکم مرتب نہیں ہوگا۔ بسا اوقات انہیں دو اصولوں کے مفہوم کی ادائیگی دوسرے الفاظ سے کی جاتی ہے، مثلاً: **الموجود شرعا کالموجود حقیقة(۵)** یعنی اگرچہ کوئی چیز حقیقت میں معدوم ہو، لیکن شریعت نے اس پر موجود ہونے کا حکم لگایا تو اسے موجود ہی شمار کیا جائے گا۔ اسی طرح "**المشغول بالحاجة الأصلية كالمعدوم**"(۶) اور اس قسم کے دیگر قواعد وہی مفہوم ادا کرتے ہیں جو مذکورہ بالا دو اصول ادا کرتے ہیں۔

۞......۞......۞

---

(۱) الأحمد نکری، القاضی عبدالنبی بن عبدالرسول، دستور العلماء = جامع العلوم فی اصطلاحات الفنون، الناشر: دارالکتب العلمیة - بیروت، ط۱۴۲۱: ہ۲۰۰۰م، ۳/۱۹۸

(۲) الزیلعی، فخرالدین عثمان بن علی (ت۷۴۳: ہ)، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، الناشر: المطبعة الکبری الأمیریة، القاہرة، ۴/۱۲۴

(۳) البابرتی، أکمل الدین محمد بن محمد (ت786: ہ)، العنایة شرح الہدایة، الناشر: دارالفکر - بیروت، (7/115)

(۴) القرافی، أبوالعباس أحمد بن إدریس (ت۶۸۴: ہ)، أنوار البروق فی أنواء الفروق، تحقیق: خلیل المنصور، الناشر: دارالکتب العلمیة - بیروت، ط۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۸م، ۲/۱۵۰

(۵) المنجور، أحمد بن علی (ت: ۹۹۵ھ)، شرح المنہج المنتخب إلی قواعد المذہب، تحقیق: محمد الشیخ محمد أمین، الناشر: دار عبدالله الشنقیطی، ۱/۱۱۶

(۶) ابن نجیم، سراج الدین عمر بن إبراہیم (ت۱۰۰۵: ہ)، النہر الفائق شرح کنز الدقائق، ۱/۴۱۴

قسط (۳)

حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتویؒ

مولانا محمد معاذ لاہوری❖

تدریس: حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتویؒ کی فراغت دار العلوم سے ۱۳۰۰ھ میں جب کہ گنگوہ شریف میں کم از کم ایک سال بھی مدت تعلیم لگائی جائے تو ۱۳۰۱ھ میں فراغت بنتی ہے، فراغت کے بعد آپؒ نے علوم میں پختگی کے لئے تدریس کا انتخاب کیا، آپؒ کی دار العلوم دیوبند میں تدریسی زندگی شوال ۱۳۰۳ھ/ جولائی ۱۸۸۶ء میں شروع ہوئی، اس سے قبل کے دو سال یا ایک سال آپ مدرسہ اسلامی تھانہ بھون میں مدرس رہے۔(۱) ۱۳۰۳ھ میں دار العلوم دیوبند میں مدرس شش مقرر کئے گئے۔(۲)

دورانِ تدریس آپؒ نے علوم وفنون کی اکثر کتب پڑھائیں، زیادہ تر جو کتب آپ کے زیر درس رہیں ان میں مشکوٰۃ شریف، شرح جامی، مختصر المعانی، جلالین شریف اور میر زاہد وغیرہ شامل ہیں۔(۳) دورۂ حدیث کی کتابوں میں صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد کی تدریس میں آپ کا نام ملتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کا درس عموماً آپ سے متعلق دیکھا گیا ہے جب کہ کتب دورہ میں آپ کی شمولیت بہت کم ہوئی۔ دریافت ریکارڈ کی موجودگی میں ۱۳۲۰ھ میں مشکوٰۃ شریف، ۱۳۲۳ھ میں سنن ابی داؤد، ۱۳۲۴ھ مشکوٰۃ المصابیح، ۱۳۲۶ھ مشکوٰۃ المصابیح، ۱۳۳۳ھ صحیح مسلم، ۱۳۳۶ھ مشکوٰۃ المصابیح، ۱۳۳۷ھ صحیح مسلم، ۱۳۳۹ھ صحیح مسلم زیر درس رہیں۔

مذکورہ معلومات ان دریافت سالوں کی ہیں جو ہمیں مختلف ذرائع سے حاصل ہوئیں، اگر محافظ خانہ دار العلوم کا ریکارڈ کھنگالا جائے تو تمام نہ سہی بہت کچھ معلومات فراہم ہوسکتی ہیں۔

طرز تدریس: حضرت حافظ صاحبؒ جن اساتذہ کے تراشے ہوئے ہیرے تھے ان میں ہر ایک اپنی اپنی جگہ انجمن تھا، آپؒ نے ان تمام حضرات کے طریقہ تدریس کو اپنے میں سمویا، آپ بر موقع، گفتگو اور مضمون پر مکمل گرفت رکھتے تھے، انداز تفہیم ایسا دل نشیں ہوتا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی بات سمجھ جاتا۔

❖ استاذ جامعہ اسلامیہ فریدیہ، لاہور

(۱) دار العلوم کی پچاس مثالی شخصیات، ص: ۸۵

(۲) روداد سال بست ویکم مدرسہ اسلامی عربی دیوبند، طبع مطبع ہاشمی، میرٹھ، بابت ۱۳۰۳ھ (۳) عکس احمد، ص: ۶۶

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ رقم طراز ہیں: ''یہ ایک عام بات تھی اور خود مجھ پر گزری ہوئی بات ہے کہ درس حدیث میں جو تقریر کسی معرکۃ الآراء حدیث پر فرماتے وہ باجود مفصل ہونے کے اس درجہ دل نشیں ہوتی اور ان کے انداز تفہیم سے اس قدر دل میں اتر جاتی کہ اگر طالب علم بھلانے کا قصد بھی کرتا تب بھی وہ شاید اسے بھول نہیں سکتا تھا۔'' (۲)

حضرت حافظ صاحبؒ کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب حال بزرگ بھی تھے، آپؒ کا یہ رنگ درس حدیث میں بھی ظاہر ہوتا تھا، حضرت قاری صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: ''مشکوٰۃ شریف میں جب کتاب الجنائز آئی اور عالم برزخ کے حوادث وواقعات کی روایتیں گزریں تو حضرت ممدوح نے ایسے تاثر اور درد آمیز شوق کے ساتھ ان پر کلام فرمایا کہ گویا عالم برزخ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس وقت دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے شوق کا ایک ایسا غلبہ قلوب میں محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہم دنیا ہی میں نہیں۔'' (۳)

ذخیرۂ احادیث میں بعض روایتیں ایسی ہیں جو کسی ہیئت اور عمل پر مشتمل ہیں، حافظ صاحب دورانِ درس ان تمام ہیئتوں کو عملاً کر کے دکھاتے اور فرماتے: ''میں نے حدیث کے درس کے وقت یوں ہی کرتے دیکھا تھا، اگر اساتذۂ حدیث اور محدثین ہیئات عمل کر کے دکھانے کا معمول نہ رکھتے تو آج کسی شرعی عمل کی کوئی مطلوب ہیئت تم لوگ محض کتاب سے متعین نہیں کر سکتے تھے۔'' (۴)

حضرت حافظ صاحب درس حدیث کے دوران اپنے اساتذ کرام کا والہانہ تذکرہ قولاً وفعلاً دونوں طرح کیا کرتے تھے، حضرت مولانا مبارک علی نگینویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ۱۳۲۴ھ کے تعلیمی سال میں آپؒ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی تھی، حضرت قاری صاحبؒ اس درس کی مختصر کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں: ''اس سال مشکوٰۃ شریف خاص اہتمام سے پڑھائی اور ختم میں بھی خاص اہتمام اختیار فرمایا، ختم کے دن حضرت ممدوح حضرت گنگوہی کا وہ جبہ پہن کر درس کے لئے تشریف لائے جو حضرتؒ نے بطور سند وتبریک عطا فرمایا تھا۔ مولانا مبارک علی صاحبؒ کا بیان ہے کہ اس دن چہرہ سے غیر معمولی وقار وتمکنت نمایاں تھا۔'' (۵)

الغرض حضرت حافظ صاحبؒ کا انداز تدریس چاشنی کی تمام جہات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تمام طلبہ کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا، طلبہ ذوق وشوق کے ساتھ آپؒ کے درس میں حاضر ہوتے اور بقدر ظرف استفادہ کرتے۔ (جاری)

---

(۱) آباء کے دیس میں، سفرنامہ مولانا زبیر احمد صدیقی، اسباق دار العلوم دیوبند، طبع ثالث: ۲۰۲۳ء، طبع مکتبہ رشیدیہ، جامعہ فاروقیہ، شجاع آباد، ضلع ملتان (۲) دار العلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص: ۹۶

(۳) دار العلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص: ۹۶ (۴) ایضاً، ص: ۹۷ (۵) ایضاً، ص: ۹۷

علمائے کرام اور سائنسدانوں کی ذمہ داریاں اور کام کا دائرہ کار

ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی ❖

تاریخِ اُمت مسلمہ کو اگر دیکھا جائے تو بہت سے فکری اور نظریاتی فرقے بنے ہیں جن سے اُمت میں افتراق وانتشار پیدا ہوا ہے۔ اگر ان فرقوں کے بننے کے عوامل پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان فرقوں کے بننے کی بنیادی وجہ قرآن وحدیث کی من مانی تشریح ہے۔ قرآنِ پاک کے معنی کیلئے جو شرائط وآداب ہیں اُن سے متعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کیلئے پندرہ علومِ دینیہ میں مہارت اور دسترس حاصل کرنا ضروری ہے اور ان میں سب سے اہم علمِ وہبی ہے جو کہ حق سبحانہ تقدس کا عطیّہ خاص ہے، جو کہ وہ اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔ یعنی تھوڑی عربی جان لینے یا اردو ترجمے دیکھ کر اگر کوئی اپنی رائے داخل کرے گا تو یہ سراسر گمراہی ہوگی۔ اگر ماضی قریب کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان فتنوں کو پیدا کرنے والوں میں بعضے پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور ایسے نام نہاد عصری علوم وجامعات کے محققین شامل تھے جنہوں نے اسلاف کی رائے سے ہٹ کر تحقیق کی آڑ میں شریعت کی من چاہی تشریح عوام کے سامنے پیش کی اور عوام کی ایک بڑی تعداد ان کی وجہ سے گمراہ ہوگئی اور یہ گمراہی پھیلانے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ تمام پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان، اور محققین حضرات ہی گمراہ ہوگئے ہیں لہذا یہ قطعاً مناسب نہیں کہ ہم عمومی طور پر ان تمام حضرات پر ہی گمراہی کا لیبل چسپاں کردیں اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ ماضی بِعید میں مسلمان سائنسدانوں میں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، فخر الدین رازی، ابو نصر محمد بن محمد فارابی، ابن سینا، محمد بن موسیٰ خوارزمی، امام غزالی، اور ابن خلدون جیسے قابلِ ذکر نام ہمیں نظر آتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر سائنسدان طب، فلکیات، طبیعات، کیمیا، فلسفہ، علم الکائنات (کونیات)، ما بعد الطبیعات، منطق، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ سائنسی علوم کے ماہر تھے اور ان میں سے کچھ کی دینی حیثیت

❖ استاذ مونسٹر ٹکنالوجی یونیورسٹی (MTU) آئرلینڈ

بھی مُسلّم تھی جن میں امام غزالی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جبکہ ماضی قریب میں ہمیں بے تحاشہ قابلِ ذکر مسلمان سائنسدان، ڈاکٹر، انجینئر، اور محققین عالمی افق پر نظر آجائیں گے جنہوں نے اپنے متعلقہ شعبے اور سائنس کی دنیا میں گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔

نیز اُمت مسلمہ میں بعض اِستثنائی مثالیں موجود ہیں جن میں بعض ڈاکٹر، محققین، انجینئر، اور سائنسدانوں ہی کو اللہ پاک نے اتنی مقبولیت نوازی کہ جنہوں نے پہلے علمائے کرام، مفتیانِ کرام اور مشائخ کی صحبت اٹھائی اور پھر انہی حضرات سے اللہ پاک نے اتنا کام لیا کہ وقت کے بڑے بڑے علمائے کرام نے ان سے فیض حاصل کیا، مثلاً حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ کہ کئی خلفاء دنیاوی شعبوں سے وابستہ تھے اور دینی اور دنیاوی شعبوں کا حسین امتزاج تھے۔ مگر ان مثالوں سے ہم عمومی طور پر یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے اور نہ ہی کرنا چاہیے کہ دین کی تشریح انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدانوں کے ذمہ ہے اور نہ ہی عمومی سطح پر اس کا اطلاق کرنا چاہیے کہ ایسی پالیساں مرتب کی جائیں کہ آگے آنے والی نسلوں میں یہ اِستثنائی مثالیں عمومیت اختیار کر لیں۔

ہمارے معاشرے میں الٹی گنگا بہہ رہی ہے یعنی جو انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان حضرات ہیں، بجائے اس کہ کہ وہ عالمی سائنسی تحقیق میں اپنا نام روشن کریں اور اپنے سائنسی شعبے میں مہارت حاصل کر کے پوری دنیا میں اپنا لوہا منوائیں اور امت کو درپیش جدید مسائل کا متبادل سائنسی حل پیش کریں، وہ اپنی ذمہ داریاں تو تندہی سے انجام نہیں دے رہے بلکہ ان ہی میں سے بعض انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان حضرات دینی مسائل میں اپنی رائے زنی شروع کر دیتے ہیں۔ یعنی آپ کو بہت سارے انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان ایسے ملیں گے کہ جن کو اُن کے اپنے سائنسی شعبے میں تو مہارت حاصل نہیں اور وہ دینی مسائل میں عوامی سطح پر فتویٰ دینے شروع کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو دینی اتھارٹی گردانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط روش ہے اور تاریخ اُمتِ مسلمہ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جو اُمت میں گمراہی پھیلی وہ اسی روش سے پھیلی اور انہی لوگوں کی دینی کم علمی، کم فہمی اور تکبر سے اُمت نے بڑے بڑے فتنے دیکھے۔

دیکھیے اگر کوئی انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان کسی خاص شعبے کا ماہر ہے اور اس شعبے سے متعلق شرعی حکم معلوم کرنا ہے تو وہ انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان اس شعبے کی مستند تکنیکی تفصیلات مستند دارالافتاء اور حضرات مفتیانِ کرام کی خدمت میں پیش کرے گا اور پھر یہ حضرات مفتیانِ کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق شرعی حکم بیان فرمائیں یعنی جواز اور عدم جواز کا فیصلہ فرمائیں۔ یہاں ایک بات ضرور ذہن میں رہے کہ مفتیانِ کرام فرماتے ہیں کہ کسی عام شخص کو اپنی صوابدید پر جواز اور عدم جواز بیان

کرنے کا حق نہیں ہے لیکن ایک عام آدمی کو مفتی کی طرف سے جواز اور عدم جواز کی حکایت بیان کرنے کا حق ہے خاص طور پر جب وہ شخص کسی سائنسی شعبے کا ماہر ہو اور اُس کو اس سائنسی ٹیکنالوجی کے معاملات اور اس کی اصل حقیقت کا علم اور ادراک ہو۔ مثلاً کوئی انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان اپنی طرف سے تحقیق کر کے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز البتہ یہ انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان، حضرات مفتیانِ کرام سے پوچھ کر اس مسئلہ کے حکم کی حکایت بیان کرسکتا ہے۔ خلاصہ اس بات کا یہ ہوا کہ انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان کا قطعاً یہ کام اور ذمہ داری نہیں کہ وہ خود فتویٰ دینا شروع کردیں اور کسی چیز کی شرعی حیثیت کی وضاحت میں اپنی رائے زنی شروع کردیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ اپنے دائرہ کار سے تجاوز کریں گے، اُن کا یہ عمل جمع بین المتضادین ہوگا اور اُن کا فتویٰ بھی شرعی طور پر معتبر نہیں ہوگا۔ حضرات علمائے کرام یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ پروفیسروں، انجینئروں، ڈاکٹروں، اور سائنسدانوں سے دینی مسائل نہ پوچھے جائیں کیونکہ اُن میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ صحیح دینی مسائل میں امت کی رہنمائی کرسکیں۔

دیکھیے ہمیں کچھ بنیادی سوالات کے جوابات واضح طور پر معلوم ہونے چاہییں۔ مثلاً، کیا شریعت میں مفتی کے علاوہ بھی کوئی شرعی مسائل کا استخراج کرسکتا ہے، قرآن وسنت سے مسائل نکال سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! کیا مفتی کے علاوہ بھی کسی کے پاس اتنا علمی رسوخ ہوتا ہے کہ وہ شریعت کے مسائل میں اتھارٹی ہو؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے۔ اس بات کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب بھی ہمیں شریعت سے متعلق کوئی حکم جاننا ہوگا ہم مستند مفتیانِ کرام سے رجوع کریں گے اور انہی سے پوچھے گئے مسائل کی روشنی میں عمل کریں گے۔

مستند مدارسِ دینیہ میں دارالافتاء میں جدید مسائل میں مختلف موضوعات پر ٹھوس شرعی تحقیق ہوتی ہے۔ ٹھوس شرعی تحقیق سے مراد یہ ہے کہ اس سائنسی موضوع کے ماہرین سے رجوع کیا جاتا ہے، سائنسی مسئلہ کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، شرعی تکییف کی جاتی ہے اور پھر کافی غور وخوض اور تحقیق کے بعد اس مسئلہ پر شرعی حُکم بتایا جاتا ہے۔ المختصر، قرآنِ پاک کی تفسیر ہو یا شریعت کے احکامات بتانا، احادیث مبارکہ سے مسائل کا استنباط ہو یا مختلف احادیث کی تطبیق، عوام کو مسائل کا حکم شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے بتانا ہو یا دینی علوم میں غور وتدبر، یہ سب کام حضرات علمائے کرام کی ذمہ داریوں میں سے ہیں اور انہی پر جچتے ہیں کہ وہ اس موضوع کے ماہر ہیں۔

اب اس کے برعکس صورتِ حال پر غور فرمائیے۔ کچھ مدارسِ دینیہ میں بعض صاحبانِ علم یہ ذہن سازی کررہے ہیں کہ آپ خود ہی سائنسی مضمون کے ماہر بن جائیں، خود ہی سائنسی موضوع پر تحقیق کریں،

اس پر سائنسی مقالے چھاپیں اور پھر اس سائنسی موضوع پر شرعی حکم بتایئے۔ یہ بھی سراسر غلط سوچ ہے اور غلط طریقہ کار ہے کہ فتویٰ کی بنیاد سائنسی موضوع کے ماہرین سے رجوع کئے بغیر ہی رکھی جائے۔ اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس سے معاشرے میں جدید مسائل کے حوالے سے تشکیک پیدا ہوجاتی ہے اور علمائے کرام کی رائے میں اختلاف کی بنیاد پڑتی ہے کیونکہ ایسے علمائے کرام کی سائنسی بنیاد ہی مضبوط نہیں ہوتی، اور وہ سائنسی شعبے کے ماہر نہیں ہوتے اور اپنے تئیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے سائنسدان اور محقق بن گئے ہیں اور انہوں نے مفتی کے ساتھ ڈاکٹر کا ٹائٹل بھی حاصل کرلیا ہے لہذا اب وہ خود ہی سائنسدان، معاشی ماہر، اور محقق بن گئے ہیں۔

آجکل نوجوان علمائے کرام کی ایک ذہن سازی یہ کی جارہی ہے کہ مسائل کا متبادل حل دینا علمائے کرام کی لازمی ذمہ داری ہے۔ دیکھئے اس میں تو دورائے نہیں کہ متبادل ہونا چاہیے اور بتانا بھی چاہیے اور بعض جید مفتیان کرام مسائل کا جواب دیتے وقت متبادل بھی بتادیتے ہیں اور سائل کو نصیحت بھی فرمادیا کرتے ہیں اور ان حضرات میں ہمارے محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ قابلِ ذکر ہیں، مگر متبادل حل دینے کی آڑ میں ناجائز کو جائز تو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ متبادل نصوص کے احکامات کے ذیل میں ہونا چاہیے۔ یعنی مثلاً شراب حرام ہے، زنا حرام ہے، سُود حرام ہے تو کیا مسلمان مفتیانِ کرام کے ذمہ فرض ہے کہ وہ زنا، شراب، اور سُود کا متبادل دیں؟ بھئی متبادل تو شریعت نے پہلے ہی سے بتادیا ہے۔ مثلاً زنا کا متبادل نکاح ہے، شراب کا متبادل دودھ یا کسی پھل کا جوس ہے، اور سُود کا متبادل کاروبار ہے۔ مگر متبادل ڈھونڈتے وقت یہ کہنا کہ نہیں ہم نے ہر حال میں متبادل دینا ہے اور شریعت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھنا ہے کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ مثلاً سُود کا متبادل دیتے وقت سُود ہی کی کسی نئی شکل کو جائز قرار دینا کسی صورت بھی قابلِ قبول نہ ہوگا۔ شراب کا متبادل دیتے وقت کسی نئی قسم کی شراب ہی کو جائز قرار دے دینا کسی صورت قابلِ قبول نہ ہوگا۔ آپ ہی انصاف فرمایئے کہ کیا اس طرح کے متبادل قابلِ قبول ہوں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ لہٰذا متبادل کی تلاش میں مسلمان مفتیانِ کرام پر ہرگز یہ لازم نہیں کہ وہ زبردستی حرام اور ناجائز چیزوں کو جائز وحلال بتلائیں۔

اسی تناظر میں ذیل کے اقتباسات بہت اہم ہیں۔

بہرحال ہمارے ملک میں بڑی ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے ذریعہ جو قرآن و سنت اور حضرت حق جل ذکرہ اور حضرت رسول اللہ ﷺ کے منشا کے مطابق صالحین کے موروثہ اثاثہ کی روشنی میں کی جائے، جدید پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرکے فیصلہ کردینا چاہیے، تاکہ دینِ اسلام کا مضبوط

اور حسین وجمیل قلعہ قیامت تک اعداء اور اغیار کے حملوں سے محفوظ رہے، مشکل سب سے بڑی یہ ہے کہ ہم یورپ کے جدید معاشی واقتصادی نظام اور معاشرتی نظام کو پہلے ہی اپنا لیتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ جوں کا توں یہ پورا نظام اسلام کے اندر فٹ ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ (۱)

فقہاء کرام نے فرمایا کہ جو آدمی اپنے اہل زمانہ سے واقف نہ ہو (یعنی اہل زمانہ کے طرز زندگی، ان کی معاشرت، ان کے معاشی معاملات اور ان کے مزاج و مذاق سے واقف نہ ہو) تو وہ جاہل ہے۔ ایک عالم کیلئے جس طرح قرآن وسنت کے احکام سے واقف ہونا ضروری ہیا سی طرح اس کیلئے زمانہ کے عرف اور زمانہ کے حالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر وہ شرعی مسائل میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام محمد بن الحسن شیبانی رحمتہ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ فقہ کی تدوین کے دوران وہ باقاعدہ بازاروں میں جا کر تاجروں کے پاس بیٹھتے، اور ان کے معاملات کو سمجھتے تھے اور یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسے طریقے بازار میں رائج ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا مقصد خود تجارت کرنا نہیں تھا، وہ صرف یہ جاننے کیلئے ان تاجروں کے پاس بیٹھتے تھے کے ان کے کیا طریقے ہیں اور ان کے درمیان آپس میں کیا عرف رائج ہے؟ اس لئے کہ ان چیزوں سے واقفیت ایک عالم اور بالخصوص ایک فقیہ اور مفتی کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اس کے بارے میں اس کے پاس سوال آئے تو وہ اس سوال کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو اس کے بغیر وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب کسی علاقے یا معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتویٰ جاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے اس لئے اس کا کام اس حد پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ صرف اتنا کہہ دے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے، بلکہ بحیثیت داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کو ناجائز اور حرام کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیا ہے؟ وہ متبادل قابلِ عمل بھی ہونا چاہیے اور شریعت کے احکام کے مطابق بھی۔ (۲)

متبادل دینے کی آڑ میں بعض صاحبانِ علم خلطِ مبحث کر چکے ہیں۔ دیکھئے متبادل کی ایک بڑی وسیع تعریف ہو سکتی ہے۔ اگر شرعی تکلیف کر کے یہ بتا دیا جائے کہ سُود حرام ہے اور آپ سُود سے بچیں، تو یہ تو حکم بتانے کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر یہ بتا دیا جائے کہ آپ سُود کے بدلے تجارت کر لیں تو یہ متبادل دینا کہلائے گا۔ مگر اگر متبادل دینے سے مُراد مسائلِ جدیدہ میں یہ ہے کہ حضرات علمائے کرام اپنے دائرہ کار

---

(۱) دینی مدارس کی ضرورت اور جدید تقاضوں کے مطابق نصاب ونظامِ تعلیم، انتخاب از مقالات محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ، جمع وترتیب محمد انور بدخشانی صاحب، صفحہ: ۱۴۲

(۲) حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ادارۃ المعارف، کراچی

سے ہی باہر نکل کر کام کریں تو یہ ہرگز مناسب نہ ہوگا۔اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔فرض کریں کہ ایک دوائی ہے جس کو بنانے میں خنزیر یعنی سور کے خلیے استعمال کئے گئے ہیں۔اب اس کا حکم بتاتے وقت یہ کہا جائے کہ اس کو استعمال کرنا منع ہے تو یہ حکم بتانے کے زمرے میں آئے گا، جیسا کہ درجِ ذیل ہے۔

کسی بھی حرام چیز کو بطورِ دوا استعمال کرنا بھی حرام ہے، الا یہ کہ بیماری مہلک یا ناقابلِ برداشت ہو اور مسلمان ماہر دین دار طبیب یہ کہہ دے کہ اس بیماری کا علاج کسی بھی حلال چیز سے ممکن نہیں ہے اور یہ یقین ہو جائے کہ شفا حرام چیز میں ہی منحصر ہے، اور کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو مجبوراً بطورِ دوا و علاج بقدرِ ضرورت حرام اشیاء کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے ورنہ نہیں۔(۱)

پھر اس کا متبادل دے دیا جائے کہ آپ اس حرام اجزاء والی دوائی کے بجائے فلاں حلال اجزاء والی دوائی استعمال کر لیجئے تو یہ بات بھی عقل میں آتی ہے۔مگر یہ مفتیانِ کرام کا دائرہ کار نہیں کہ وہ ہر دوائی سے متعلق تحقیق کریں کہ فلاں دوائی کا متبادل کون کون سے ہیں۔یہ سائل ہی کے ذمہ ہے کہ وہ حضرات مفتیانِ کرام سے پوچھ پوچھ کر مسلمان ماہر دین دار طبیب سے پوچھ کر متبادل تلاش کرے۔مسئلہ تب شروع ہوتا ہے کہ جب نوجوان مفتیانِ کرام کی ذہن سازی کی جائے اور اُن کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ آپ خود تحقیق کیجئے اور جدید طبی علوم کو سیکھئے اور پھر سیکھ کر اس حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل دیجئے۔یعنی نوجوان مفتیانِ کرام بذاتِ خود ایم بی بی ایس MBBS کریں، پھر ایم ڈی M.D. کریں اور پھر کلینیکل پریکٹس کریں اور طبی دواؤں پر لیبارٹری میں تحقیق کریں اور پھر حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل دیں۔یعنی مدارسِ دینیہ کے اندر طب کی تحقیق سے متعلق شعبے قائم ہوں جس کے اندر اس مسئلے پر تحقیق کی جائے اور امت کو نئی دوائی بنا کر اس حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل پیش کیا جائے جو کہ امت کے ضرورت کا حل ہو۔ہماری گزارش ہوگی کہ یہ مسلمان علمائے کرام اور مدارس کی قطعاً ذمہ داری نہیں کہ وہ اس طرح کی تحقیق کریں بلکہ یہ تو ان کے دائرہ کار ہی میں نہیں آتا اور جو صاحبانِ علم اس طریقے کی ذہن سازی کر رہے ہیں ان کو خلطِ مبحث ہو چکا ہے۔اس میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ امتِ مسلمہ کو اس حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل ملنا چاہیے، مگر یہ ذمہ داری کس کی ہے، اس کا تعین ضروری ہے۔سب سے پہلے تو یہ مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ مسلمانوں کیلئے حلال اجزاء والی دوائیاں ملک میں درآمد کریں اور عالمی دوا ساز کمپنیوں سے گفت وشنید کریں تاکہ عالمی دوا ساز کمپنیاں مسلمان ممالک میں حلال اجزاء والی دوائیاں ہی بھیجیں۔اس کیلئے مسلمان ممالک او آئی سی کا فورم بھی متحرک کر سکتے ہیں۔نیز ملک کے اندر حکومتی حلال کمیٹیوں کے ذریعے بھی اس کا حل نکالا جا سکتا ہے۔اصولی طور پر تو

(۱) فتوی نمبر:144110200078 دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

مسلمان ممالک کو سائنس میں اتنی ترقی کرنی چاہیے کہ وہ خود ایسی دوائیاں ملک کے اندر بنائیں اور یہ مسلمان سائنسدانوں اور محققین کا کام ہے کہ وہ ایسی سائنسی تحقیق کریں جس سے امت کی ضرورت کو پورا کیا جائے اور متبادل حل پیش کرنا مسلمان سائنسدانوں اور اس متعلقہ شعبے کے ماہرین کی ہی ذمہ داری ہے۔

متبادل حلال طریقہ بتاتے وقت علمائے کرام کا دائرہ کار کیا ہوگا اس کو ایک اور مثال سے سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ علمائے کرام کو معاملات کی خبر ہونی چاہیے مگر اس سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ وہ خود ہی ماہر بن جائیں۔ نیز اتنی استعداد حضرات مفتیانِ کرام میں ہونی چاہیے کہ وہ زیرِ نظر مسئلہ کی باریکیوں کو بھی سمجھ سکیں تاکہ مسئلہ کی شرعی تکییف میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ مثلاً اگر ایک سوال دارالافتاء میں آیا کہ یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی کا کیا حکم ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں تحقیق اور مشاہدے کے بعد حضرات مفتیانِ کرام یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی سے اجتناب کا کہتے ہیں۔

یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی کے سوال کا جواب بتاتے وقت مفتیانِ کرام نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ سب سے پہلے وہ کمپیوٹر سائنس کے ماہرین سے رجوع کر کے سمجھیں گے کہ یوٹیوب پر اشتہارات کس طریقے سے کام کرتے ہیں، ان اشتہارات پر کس کا کنٹرول ہوتا ہے، یوٹیوب پر جب کوئی مونیٹائیزیشن (اشتہارات وغیرہ سے پیسے کمانا) شروع کرے گا تو اس میں کن کن عوامل کی بنیاد پر اشتہارات چلیں گے جیسے جغرافیائی محل وقوع، سرچنگ ہسٹری، وغیرہ۔ نیز جب یوٹیوب پر کوئی اکاؤنٹ کھول رہا ہیتو وہ کیا معاہدہ کر رہا ہے، اس میں کون کون سی بنیادی شقیں ہیں جن کو صارف نے قبول کیا ہے۔ پھر مفتیانِ کرام مختلف قسم کے اشتہارات کی اقسام کو دیکھیں گے۔ پھر جب کمپیوٹر سائنس کے ماہرین سے رجوع کرنے کے بعد، تحقیق اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ویڈیو بنانے والے کو اس بات کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرضی کے اشتہار چلانے پر یوٹیوب کو پابند کرے، اور اکثر اوقات یہ اشتہارات غیر شرعی چیزوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اور اس کے علاوہ بھی ان اشتہارات میں کئی مفاسد ہوتے ہیں جیسے میوزک، نامحرم کی تصاویر، اور جاندار کی تصاویر وغیرہ۔ تو ان تمام باتوں کا احاطہ کرنے کے بعد مفتیانِ کرام یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی کا حکم بتائیں گے جو کہ اس سے اجتناب کا ہے۔

اب جب حلال متبادل حل دینے کی بات آئی تو حضرات مفتیانِ کرام یہ کہیں گے کہ سائل کے ذمہ لازمی تھوڑی ہے کہ یوٹیوب کے ذریعے ہی اشتہارات سے کمائی کرے، سائل کو چاہیے کہ وہ کسی اور حلال طریقہ کاروبار سے کمائی کرلے۔ کوئی بھی مفتیانِ کرام سے یہ توقع نہیں رکھے گا کہ پہلے وہ کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کریں، پھر کئی سال کمپیوٹر سائنس میں عالمی معیار کی تحقیق کریں اور پھر اس

مسئلہ کا جواب دیں۔ نیز کوئی بھی مفتیانِ کرام سے یہ توقع نہیں رکھے گا کہ خود مفتیانِ کرام ہی یوٹیوب کا متبادل دیں یعنی یوٹیوب سے ملتا جلتا اسٹریمنگ پلیٹ فارم بنائیں جس میں نہ میوزک ہو، نہ نامحرم کی تصاویر ہوں، نہ جاندار کی تصاویر ہوں اور نہ ہی کوئی دوسرا شرعی محظور ہو۔ بلکہ اگر کوئی مفتی صاحب ایسا کریں گے تو وہ اپنے دائرہ کار اور حدود سے تجاوز کریں گے کیونکہ یوٹیوب کا متبادل حل دینا، کمپیوٹر سائنسدانوں کے دائرہ کار میں آتا ہے اور یہ اسلامی حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ متعلقہ محکموں کے ذریعے سے یوٹیوب جیسے متبادل پلیٹ فارمز کا اجراء کریں جن میں شرعی قباحتیں موجود نہ ہوں۔

جس طریقے سے اگر کوئی سائنسدان، محقق، پروفیسر اور انجینئر اپنے شعبے کے دائرہ کار سے نکلیگا اور اپنے شعبے سے نکل کر شریعت کی باتوں میں دخل دے گا، قرآن وحدیث کی من مانی تشریح کرے گا، اور خود ہی فقہی احکامات نکالنے شروع کرے گا تو اس سے گمراہی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ بعینہٖ اگر نوجوان مفتیانِ کرام تحقیق کے نام پر خود ہی سائنسدان، محقق، انجینئر اور پروفیسر بن جائیں گے اور سائنس کے شعبے میں رائے زنی کریں گے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟

الحاصل مقصود البیان یہ ہوا کہ علمائے کرام اور سائنسدانوں کے ذمہ لازم ہیکہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کریں اور اپنے فرائضِ منصبی نبھائیں یعنی جو ذمہ داریاں حضرات علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کی ہیں وہ اُن پر کاربند رہیں اور جو سائنسدانوں، محققین، پروفیسر اور انجینئر حضرات کی ذمہ داریاں ہیں، وہ اُن ذمہ داریوں کو پوری تندہی کے ساتھ انجام دیں۔ اسی سے معاشرہ اِفراط وتفریط سے بچے گا اور ترقی کرے گا۔ اگر علمائے کرام اور سائنسدان اپنے اپنے دائرہ کار سے تجاوز کریں گے تو اسی سے معاشرے میں ابتری پھیلے گی اور خلطِ مبحث پیدا ہوگا۔ اللہ پاک امتِ مسلمہ کی ہر قسم کے فتنوں اور گمراہی سے حفاظت فرمائیں، آمین۔

غیبت ایک لذیذ گناہ

مولانا عبد المتین ❖

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ (۱) کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے سو اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔

غیبت کی تعریف

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارا بھائی تمہارے سامنے نہیں موجود نہیں اور تم اس کا ذکر اس طرح کرو کہ اگر وہ موجود ہوتا تو اسے برا لگتا تو سمجھو یہ غیبت ہے۔

غیبت اور عزت و آبرو کی دھجیاں اڑانا

دین اسلام کے مقاصد میں شامل ہے کہ مال، عزت آبرو اور جان کو ہر حال میں تحفظ ملے۔ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس کا تعلق براہ راست انسان کی عزت و آبرو کے ساتھ ہے۔ گویا جو شخص غیبت کا شکار ہو جائے وہ اپنے بھائی کی عزت و آبرو کے ساتھ کھیل رہا ہے جو کسی صورت جائز نہیں بلکہ بہت بڑا جرم ہے۔

غیبت اور آدم خوری

سورہ حجرات کی مذکورہ آیت میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ وہ آدم خوری کرے یعنی انسانی گوشت کھائے اور گوشت بھی کسی زندہ انسان کا نہیں بلکہ مردے کا اور وہ مردہ بھی کوئی غیر نہیں بلکہ تمہارا اپنا بھائی مزید فرمایا کہ جب تم اس قدر گراوٹ جیسی حرکت نہیں کر سکتے اور ایسا سوچ بھی نہیں تو غیبت بھی اتنا ہی بڑا جرم ہے لہذا اس سے بھی بچو اور اللہ سے اور اللہ کے بندوں سے معافی مانگو اللہ بے شک معاف کرنے والا ہے۔

غیبت ایک عظیم گناہ

رسول اللہ ﷺ معراج کے سفر میں کچھ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے ناخن لوہے کے ہیں اور

❖ مدیر مدرسہ دار ارقم، کراچی

(۱) الحجرات: ۱۲

وہ اپنے چہرے اور سینوں کو زخمی کر رہے ہیں پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو غیبت کر کے اپنے بھائیوں کی عزتوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔

غیبت گناہ کبیرہ

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ غیبت گناہ کبیرہ میں شامل ہے ایسے ہی جیسے چوری، شراب، بدکاری وغیرہ۔ بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کا تعلق اللہ سے ہے جنہیں ہم حقوق اللہ کے نام سے جانتے ہیں جنہیں اللہ توبہ کے بعد معاف فرما دیتے ہیں۔ لیکن کچھ گناہ ایسے ہیں جو حقوق العباد کہلاتے ہیں، جن کی معافی جب تک اس بندے سے نہ ملے معاف نہیں ہوتے۔

غیبت مجلس کا لذیذ ترین گناہ

ہماری مجالس میں اکثر غیبت ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ بظاہر اس قدر شیریں لذیذ اور میٹھا گناہ ہے کہ ایک مرتبہ تذکرہ چل پڑے تو رکنے کو دل نہیں چاہتا۔ غیبت جس طرح کرنا حرام ہے ویسے ہی غیبت سننا بھی حرام ہے اور غیبت والی مجلس میں جان بوجھ کر بیٹھے رہنا بھی حرام ہے۔ ایسی مجلس میں اگر کوئی بیٹھا ہو تو پہلی کوشش کرے کہ غیبت کرنے والے کو منع کرے، روکنے کی کوشش کرے، اس میں دل شکنی کا خوف نہ رکھے بلکہ دین شکنی کی فکر کرے۔ اگر سامنے والا بات نہیں مان رہا تو کوشش کرے کہ موضوع بدل دے، اگر یہ بھی نہ ہو تو سکے تو آخری حل یہ ہے کہ اس مجلس سے ہی اٹھ کر چلا جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں تو سامنے بھی کہتا ہوں تو واضح کیا جائے کہ وہ آپ کا مسئلہ ہے لیکن اس وقت آپ پیٹھ پیچھے ہی بات کر رہے ہیں جو کہ غیبت ہے۔

غیبت اور آپسی تعلقات

غیبت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ دلوں سے محبت، احترام اور تعلق کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتا ہے، جس گھر یا دفتر میں غیبت کا ماحول پیدا ہو تو وہاں آپس کے تعلقات میں ہمدردی اور صلہ رحمی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کی ذات کو گلی سڑک دہلیز اور قہوہ خانوں میں موضوع بناتے ہیں تو وہاں اتحاد و الفت کا پیدا ہونا محال ہو جاتا ہے بلکہ غیبت کا عمل آہستہ آہستہ دلوں میں نفرت عداوت کو مضبوط کرتا ہے اور اک معمولی سا اشارہ اس اندر کی آگ کو شدید جھگڑے میں بدل دیتا ہے۔

غیبت ایک نشہ

شیخ سعدی رح فرماتے ہیں جو شخص آپ کے ساتھ بیٹھ کر کسی کی غیبت کرے تو یہ بات یقینی ہے کہ

وہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کی آپ کی غیبت بھی ضرور کرے گا، کیونکہ غیبت ایک لت اور بیماری ہے جو ہر جگہ اپنا نشہ پورا کرنا چاہتی ہے، لہذا بعض اوقات ایک گھر یا معاشرے میں کوئی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کسی کی غیبت کرتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ میرا خیر خواہ ہے میرے دشمنوں کے خلاف ہے جبکہ وہ کسی کا دوست نہیں ہوتا بلکہ ایک بیمار نشئی کی طرح اپنا نشہ پورا کر رہا ہوتا ہے جسے یہ موقع کل پرسوں آپ کے دشمن کی مجلس میں بھی مل سکتا ہے۔

غیبت کا علاج

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ غیبت کا علاج یہ ذکر فرماتے ہیں کہ جب بولے تو سوچ سمجھ کر بولے اور اپنی مجلس میں موجود لوگوں کے علاوہ کسی تیسرے کا تذکرہ ہی نہ کرے چاہے وہ اچھا تذکرہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ عام طور پر کسی کی اچھائی کا تذکرہ کرتے کرتے ہم اگر مگر لیکن کا یوٹرن لے کر غیبت کی شارع پر نکل پڑتے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔

زبان کی حفاظت اور غیبت

امام شافعی رح سے جب کوئی سوال کرتا تو جواب دینے سے پہلے کچھ دیر خاموش رہتے کہ اس کا جواب دینا ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (سورہ ق)

وہ زبان سے کوئی بات نہیں نکالتا مگر یہ کہ ایک محافظ فرشتہ اس کے پاس تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ اچھی یا بری ہماری ہر بات نوٹ ہو رہی ہے، اور نوٹ کون کر رہا ہے فرمایا وہ عتید ہے یعنی ہر وقت تیار بیٹھا ہوا ہے ہماری حرکات وسکنات کو نوٹ کرنے کے لیے۔ نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو نصیحت فرمائی کہ اپنی زبان پر قابو رکھنا، حضرت معاذ رض نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا زبان کی وجہ سے بھی باز پرس ہوگی؟ نبی ﷺ نے فرمایا بہت سے لوگ قیامت کیدن زبان کی وجہ سے اوندھے منہ پڑے رہیں گے ہلاک ہوں گے۔ زبان ہمارے لیے ایک سرکاری مشینری ہے جو مفت میں مل چکی ہے تبھی اس کا اندھا دھند استعمال عام نظر آتا ہے، جب چاہا بے دھڑک استعمال کیا، گالم گلوچ، غیبت، گانا بجانا، فضولیات وغیرہ جبکہ اس کے درست استعمال سے ہم نیکیوں کا خزانہ سمیٹ سکتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "کَلِمَتَانِ خفيفتان على اللسان، ثقيلتان في الميزان، حبيبتان إلى الرحمن :سبحان الله وبحمده، سبحان الله العظيم" (صحیح)

دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بڑے ہلکے ہیں، میزان میں بڑے وزنی ہیں، رحمٰن کو بڑے محبوب ہیں وہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ہیں۔

صلاۃ التسبیح صغریٰ

طریقہ وثبوت احادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں

مولانا محمد طیب حنیف ❖

یوں تو رسولِ خدا ﷺ کی حیات کا ہر ہر گوشہ اور آپ کی تعلیمات کا ہر باب منصف مزاج واہل نظر کے لئے آپ کی نبوت ورسالت اور دین اسلام کے عالمگیر وجامع مذہب ہونے کی روشن دلیل ہے، جس میں تاروز قیامت جنم لینے والے فرد انسانی کے لئے زندگی کے ہر موڑ سے متعلق کامل ومکمل رہنمائی ملتی ہیاور ذرا بھر بھی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ لیکن حق تعالی کی معرفت، محبت وخشیت، اخبات وانابت، رحمت وجلالِ خداوندی کا مکمل استحضار، ذکر ونوافل کی شکل میں ہمہ وقتی تعلق ووابستگی یہ آپ کا وہ زندہ جاوید معجزہ ہے جو آج بھی پوری تابانی کے ساتھ روشن ہے۔

تعلیمات نبویہ ﷺ کی روشنی میں ذکر پر مشتمل ایک نفلی نماز صلاۃ التسبیح کا ثبوت ملتا ہے، جس کی تعلیم آپ نے خود اپنے چچا حضرت عباسؓ کو فرمائی، اور اس نماز کو گلے پچھلے تمام (صغائر) گناہوں کی معافی کا اکسیر قرار دیا۔ اسی صلاۃ التسبیح کے ساتھ روایات میں ایک مختصر صلاۃ التسبیح کا بھی ذکر ملتا ہے، جس سے متعلق مفتی اعظم محمد شفیع عثمانی صاحبؒ اپنے رسالہ ''نجات المسلمین'' میں لکھتے ہیں: ''صلاۃ التسبیح مشہور تو یہی ہے جس کی تفصیل اوپر لکھی گئی، بعض احادیث میں ایک اور صورت بھی منقول ہے، جو دینی ودنیوی مقاصد کے پورے ہونے کے لئے مجرب ہے، اور مشائخ نے ''صلاۃ التسبیح صغریٰ'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔''(۱)

چنانچہ ان کے صاحبزادے وجانشین مفتی رفیع صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جو لوگ بڑی صلوۃ التسبیح پڑھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا اس کے پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ آسانی سے چھوٹی صلاۃ التسبیح پڑھ سکتے ہیں، بلکہ روزانہ پڑھ سکتے ہیں، اور پھر اپنی مغفرت وبخشش ودیگر اچھے مقاصد میں کامیابی کی دعا مانگ سکتے ہیں۔''(۲)

❖ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، پاکستان

(۱) نجات المسلمین، دارالاشاعت، صفحہ نمبر ۲۵

(۲) صلاۃ التسبیح کے فضائل ومسائل، صفحہ نمبر ۱۷

مختصر صلاۃ التسبیح کا طریقہ: اس مختصر صلاۃ التسبیح کا طریقہ احادیث یہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی (نفل) نماز سے سلام پھیر کر یا دورانِ نماز، کسی بھی رکن کی ادائیگی کے وقت مثلاً تشہد کے بعد ''سبحان اللہ، ۱۰/ بار، الحمدللہ ۱۰/ بار اور اللہ اکبر ۱۰/ بار پڑھے، اور پھر (نماز سے فارغ ہوکر) اللہ سے اپنی دینی یا دنیوی حاجت کی تکمیل کے لئے دعا کرے۔ ان شاء اللہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ احادیث میں ان کلمات کے پڑھنے کا کوئی خاص محل ذکر نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا اس میں مصلی کو اختیار حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں روایات ملاحظہ ہوں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت: عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ، غَدَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: عَلِّمْنِي كَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ فِي صَلَاتِي، فَقَالَ: كَبِّرِي اللَّهَ عَشْرًا، وَسَبِّحِي اللَّهَ عَشْرًا، وَاحْمَدِيهِ عَشْرًا، ثُمَّ سَلِي مَا شِئْتِ، يقول: نعم نعم.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی والدہ ام سلیم ایک دفعہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: مجھے ایسے کلمات سکھلا دیجئے جن کو میں نماز میں پڑھوں، آپ نے فرمایا: دس دفعہ ''اللہ اکبر، دس دفعہ، سبحان اللہ، اور دس دفعہ الحمدللہ، کہو، پھر جو چاہے دعا مانگو، وہ (اللہ) ہر چیز پر ہاں ہاں کہتا ہے (یعنی اس دعا کو قبول کرتا ہے)

نوٹ: مذکورہ روایت میں ''نماز میں پڑھنے'' کا ذکر ملتا ہے، مگر مسند احمد میں منقول روایت اس قید سے خالی ہے، لہذا مصلی کو اختیار ہے، چاہے دوران نماز کسی رکن سے فارغ ہوکر پڑھے یا نماز کا سلام پھیر کر پڑھے۔

تخریج روایت: یہ روایت سنن ترمذی میں کتاب الصلاۃ ''باب ما جاء فی صلاۃ التسبیح'' (۱) امام احمدؒ نے اپنی مسند میں (۲)، امام نسائیؒ نے اپنی سنن میں (۳)، حاکمؒ نے مستدرک علی الصحیحین میں (۴) ابن خزیمہؒ نے اپنی صحیح میں (۵)، ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں (۶)، جلال الدین سیوطی نے الجامع الصغیر (۷) میں، ابن علانؒ نے الفتوحات الربانیۃ میں (۸) اور علامہ مناویؒ نے

(۱) سنن ترمذی، باب ماجاء فی صلاۃ التسبیح، حدیث نمبر ۴۸۱۔ ۱/۶۰۵، دار الغرب الاسلامی، بیروت
(۲) مسند احمد، حدیث نمبر ۱۲۲۰۷۔ ۱۹/۲۴۱، مؤسسۃ الرسالۃ
(۳) سنن نسائی، کتاب السہو، باب الذکر بعد التشہد، حدیث نمبر ۱۲۹۹۔ ۳/۵۱، مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، حلب
(۴) المستدرک علی الصحیحین، حدیث نمبر ۱۱۹۱، ۱/۴۶۲، دار الکتب العلمیۃ بیروت
(۵) صحیح ابن خزیمہ، باب إباحة التسبيح والتحميد والتكبير في الصلاة عند إرادة المرء مسألة حاجة يسألها ربه عز وجل. حدیث نمبر ۸۵۰۔ ۱/۴۳۰، المکتب الاسلامی
(۶) صحیح ابن حبان، فصل فی النفوت، ''باب في ذكر الأمر بالتسبيح، والتحميد والتكبير للمرء بعدد معلوم في عقب صلاته'' حدیث نمبر ۲۰۱۱۔ ۵/۳۵۳، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
(۷) الجامع الصغیر للسیوطی ۶۹۷۸ (۸) الفتوحات الربانیۃ علی الأذکار النواویۃ لابن علان، صفحہ نمبر ۴/۳۰۸، مکتبۃ شاملۃ

فیض القدیر(۱) میں اس روایت کونقل کیا ہے۔

فائدہ: اسی مفہوم پر مشتمل معمولی الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے ساتھ اس کوابو یعلی نے اپنی مسند میں (۲)، طبرانی نے الدعاء میں (۳) نور الدین ہیثمیؒ نے اپنی کتاب کشف الأستار عن زوائد البزار میں (۴) اور ابو سعید نقاش نے فوائد العراقیین میں (۵) اس کو نقل کیا ہے۔

مفہومِ تسبیح وتحمید: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ "میں تسبیح وتحمید کا مفہوم ذکر کرتے ہیں،جس کا حاصل یہ ہے: "انسانی قدرت وبساط میں رب تعالی شانہ کی غیر متناہی ذات کا دو جہتوں کوملحوظ رکھتے ہوئے تصور باندھنا ممکن ہے:

(۱) وہ ذات مخلوق میں موجود تمام نقائص وعیوب سے پاک ہے (۲) مخلوق میں متصور تمام خوبیاں بدرجہ اتم واکمل اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ تسبیح کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالی کی ذات قدسی کو عیوب ونقائص سے محفوظ قرار دینے کا اعتراف کرنا، جبکہ تحمید کی غایت اللہ رب العزت کی ذات گرامی میں کمالات وصفات ومحاسن جمیلہ کو ثابت کرنا ہے۔ جب یہ دونوں صفات کسی ایک جملہ میں اکھٹے ہوجائیں تو انسان کے واسطے معرفتِ ربانی کی بہترین تعبیر ادا کرتے ہیں۔" (۶)

تسبیح وتحمید کے مابین موازنہ: تسبیح وتحمید کے مابین نہایت لطیف ودقیق موازنہ پیش کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: "یہ بات بھی مدنظر رہے کہ حمد ایک ثبوتی عمل ہے (جس کو صفات جمالیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے)، جبکہ تسبیح صفات سلبیہ میں سے ہے (جس کو صفات جلالیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے)، اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ صفات ثبوتیہ سلبیہ سے بلند درجہ ومقام رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کی تائید ترمذی شریف کی روایت کے کلمات سے بھی ہوتی ہے "**التسبیح نصف المیزان والحمدللہ یملؤہ**" (۷) تسبیح نصف میزان ہے اور تحمید پورے پلڑے کو بھر دیتا ہے (۸)

(۱) فیض القدیر شرح جامع الصغیر لعبد الرؤف المناوی، ۴۶۴۱۔ ۴/۸۶، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، المصر
(۲) مسند أبي یعلی، مسانید سعید بن سنان عن أنس بن مالک، رقم الحدیث ۴۲۹۲۔ ۷/۲۷۱، دار المامون للتراث، دمشق
(۳) الدعاء للطبرانی، باب التسبیح فی ادبار الصلوات، زحدیث نمبر 725۔ 230، دار الکتب العلمیۃ، بیروت
(۴) کشف الأستار عن زوائد البزار، 4/21، رقم الحدیث 3096، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت
(۵) فوائد العراقیین، للنقاش صفحہ 36، مکتبۃ القرآن، مصر
(۶) حجۃ اللہ البالغۃ، ۲/۱۱۲، دار الجبل، بیروت، لبنان
(۷) سنن الترمذی، کتاب الدعوات، حدیث نمبر ۳۵۱۹
(۸) حجۃ اللہ البالغۃ 2/112، دار الجبل، بیروت، لبنان

قابلِ اصلاح پہلو : علامہ مناویؒ نے اس حدیث کے ذیل میں بحوالہ امام غزالیؒ لکھا ہے کہ ''دعا کی قبولیت کے واسطہ معنی ومفہوم کا استحضار کیے بغیر صرف زبان کو حرکت دینا کافی نہیں، (بلکہ ہر مفہوم میں پنہاں لطائف ومعارف کا استحضار قبولیتِ دعا میں ایک مستقل تاثیر کا باعث ہوتا ہے) چنانچہ کلمہ ''سبحان اللہ'' یہ حق تعالی شانہ کی نقائص وعیوب سے منزہ وبرتر ہونے پر دلالت کرتا ہے، کلمہ ''الحمدللہ'' کا مضمون اللہ رب العزت کے تن تنہاں منعم حقیقی ہونے کا اعتراف اور اس کی تعظیم کو باور کراتا ہے، لہذا ان معارف کا استحضار جو ایمان ویقین میں ترقی کا باعث ہیں اجابت دعا میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔(۱)

مختصر صلاۃ التسبیح کی فضیلت : اس مختصر صلاۃ التسبیح کی فضلیت سے متعلق روایت میں صراحت ملتی ہے کہ اس عمل کے بعد اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مانگی جانے والی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے، بشرطیکہ دل وزباں آپس میں موافق ہوں، اور کوئی امر خارجی مانع نہ ہو، ایسی صورت میں وہ دعا اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ نیز یہ مختصر عمل تسبیح، تحمید وتکبیر پر مشتمل ہے، جس کے موجبِ رحمت وبرکت ہونے سے متعلق متعدد روایات ذخیرہ احادیث میں ملتی ہیں۔

سندِ حدیث پر کلام: امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد اس پر ''حسن غریب'' کا حکم لگایا (۲) اسی طرح علامہ ضیاء الدین مقدسیؒ نے اپنی کتاب ''الأحادیث المختارۃ'' میں اس حدیث کو چار طرق سے ذکر کرنے کے بعد اس کی سند کو ''حسن'' کے درجہ پر قرار دیا ہے۔(۳)

علامہ مناویؒ نے مذکورہ حدیث کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''إسنادہ حسن أو صحیح'' (۴) (اس حدیث کی سند حسن یا صحیح ہے)

خلاصہ یہی ہے مذکورہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن یا صحیح ہے۔ لہذا اس کو اپنے یومیہ معمولات کا حصہ بنانا ہر صاحب ایمان کے لئے بیش بہاں خزینہ کا حصول ہے، اللہ رب العزت ہم سب کو اپنی رضا کے موافق نبی ﷺ کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے اور علم صحیح کی معرفت نصیب فرمائے۔ آمین

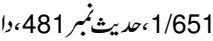

---

(۱) فیض القدیر 4641 ، المکتبۃ التجاریۃ الکبری۔ المصر

(۲) سنن ترمذی، ابواب الوتر، باب ماجاء فی صلاۃ التسبیح، 1/651، حدیث نمبر 481، دار الغرب الاسلامی، مصر

(۳) الاحادیث المختارۃ، 4/353، حدیث نمبر 1518 ، دار خضر، بیروت

(۴) التیسیر بشرح الجامع الصغیر، حرف السین، 2/52، مکتبۃ الامام الشافعی، ریاض

قسط (۲۷)

علم کلام جدید

تعارف، مسائل اور مباحث: اصولِ نانوتوی کی روشنی میں

حکیم فخر الاسلام ❖

۶-اصولِ مذہب عقلی ہیں

[فروع خلافِ عقل نہیں؛ مگر عقل کی رسائی ہو پانا ضروری نہیں]

گزشتہ بیانات سے اِجمالی طور پر اِن امور کی نشان دہی تو ہوگئی کہ: خدا کی اطاعت خود بندے کے حق میں نافع ہے، سب سے اول لائقِ معرفت خدا کی ذات ہے، خدا کی اطاعت ایک طبعی بات اور دلی تقاضا ہے۔ علاوہ ازیں، شہرِ مطلوب کے لیے راہِ مستقیم کی ضرورت، راہِ مستقیم سے بھٹک جانے کے اسباب وغیرہ پر بھی روشنی پڑ گئی۔ اور یہ سب چیزیں عقلی حیثیت سے زیرِ بحث اِس لیے آئی ہیں کہ ملحدوں کے نزدیک ہدایاتِ وحی و رسالت تو لائقِ اِلتفات ہی نہیں۔ اسی لیے تو: توحید و رسالت کو دلیلِ راہ ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور مذہب حق کا خطاب جو کہ اقوام عالم سے ہے، اس لئے یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ "مذہب کے اصول عقلی ہیں۔" اور یہ بھی کہ "فروع کا خلافِ عقل نہ ہونا ضروری ہے۔" یہی وجہ ہے کہ مذہبِ اسلام پر جب کبھی معاندین و معترضین کی جانب سے دلیل پر مبنی کوئی عقلی شبہہ کیا گیا، تو علمائے اہلِ اسلام نے اُس کا جواب دینا اور عقل ہی کی راہ سے اِلتباس و اِشتباہ کا اِزالہ کرنا اپنا منصبی فریضہ سمجھا۔ اِس کا ایک نمونہ یہی زیرِ بحث مسئلہ ہے کہ

اشتباہ

ملحدوں کی جانب سے یہ خلجان پیدا کیا گیا ہے کہ اطاعتِ خداوندی بندے کے لیے نافع ہونا مسلم تو تبھی ہو جب نفع ونقصان، بھلائی برائی کے معیارات مسلم ہوں؛ لیکن جو شخص نفع ونقصان اور بھلائی برائی کو ہی تسلیم نہ کرے، وہ اِس اصول کو [اطاعت خداوندی کا بندے کے لیے نافع ہونا] کیوں کر مانے!

❖ فاضل درسیات، بی یو ایم ایس علی گڑھ۔ ایم ڈی یونانی جامعہ ہمدرد، دہلی

اِزالہ اِشتباہ

اِس خلجان کے ازالہ کے لیے عقلی حیثیت سے گفتگو کا پیرایہ ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ خیر کو خیر اور شر کو شر سمجھنے کا مسئلہ ایک بدیہی امر ہے جسے ہر شخص جانتا ہے: ”تمام جہاں اِس پر متفق ہے کہ بعض اعمال بھلے اور بعض برے ہیں، تفصیل میں البتہ اِختلاف ہے۔“(۱) اور تفصیل میں اِختلاف کی ایک نوعیت یہ ہے کہ خیر و شر کو طبیعت کی رغبت ونفرت سے متعلق قرار دیا جائے اور مذہب کو اُس میں مزاحم سمجھا جائے اہلِ اِلحاد کی ایک عام روش ہے، جس کی بنیادی وجہ اُن کا یہ خیال ہے کہ عقل اور طبیعت تو مذہب حق کی حمایت کر ہی نہیں سکتیں۔ان کا یہ دعویٰ ہے کہ عقل سے انسانی لذات وخواہشات کی تکمیل میں اِعانت حاصل کرنا تو درست! باقی اُسے کسی اور کام میں لگانا، یعنی مذہب کی موافقت کی خدمت اُس سے لینا، یہ خود ایک خلافِ عقل بات ہے۔بایں نظر مذہب مخالف مفکروں کی جانب سے عقل اور میلانِ طبیعت [یعنی طبیعت کی رغبت ونفرت] کے حوالہ سے دو اعتراض کیے گئے ہیں، جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

رغبتِ طبیعت اور ہدایتِ عقل

اعتراض ۱-طبیعت کی رغبت اور عقل کی ہدایت اِلحاد پر اُبھارتی ہے۔

”خدا اور مذہب کی باتیں، ماحول، تعلیمات وغیرہ چیزیں، جنہیں بچہ اختیار کرتا ہے، خدا کا اور مذہب کا تذکرہ اُس کے سامنے ہوتا ہے، جسے وہ قبول کرتا رہتا ہے، ورنہ اپنی اصل سے وہ اتھیئسٹ [ملحد] ہوتا ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کے زیرِ اثر خدا اور مذہب کی باتیں بچے کے کان میں نہ پڑیں، تو طبیعت کی رغبت اور عقل کی ہدایت اُسے اِلحاد اختیار کرنے پر ہی اُبھارے گی۔اِس مقدمہ پر طبعی رغبت کو بدیہی حقیقت قرار دیتے ہوئے اُن مفکروں کی جانب سے یہ صدائے عام بھی کردی گئی کہ: جس کا جی چاہے تجربہ کرلے چناں چہ (۱) حاشیہ تقریر دل پذیر از مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ۔ یہ گفتگو تفصیل کے ساتھ آگے آئے گی نمبر ۸ نفع ونقصان، خیر وشر کے تحت آئے گی۔ ”اِس کا تجربہ اِس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸ سال کی عمر تک بچہ کے سامنے مذہب کی کوئی بات نہ لائی جائے، تو [دیکھیے نتیجہ کیا ہوتا ہے،] لامحالہ [اُس کی رغبتِ طبیعت اور ہدایتِ عقل اُسے اِلحاد پر اُبھارے گی اور] وہ [مُلحد اور] اتھیئسٹ ہوگا۔......“

پھر اسی تجربہ کی راہ سے طبعی رغبت اور ہدایتِ عقل میں رکاوٹ کی نشاندہی کی گئی ہے کہ: ”ہوتا یہ ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور ماں باپ اُسے اِس سے پہلے کہ بچہ کے پاس کوئی چوائز ہو، اپنا دھرم اُس میں اِنجکٹ کردیتے ہیں پورا کا پورا۔ بچہ کی کوئی چوائز تھوڑی ہوتی ہے، وہ وہی [اِنجکٹ کیا ہوا دھرم] سیکھ لیتا ہے۔“

خبر نامہ

احوال وکوائف

جدید داخلوں کی کارروائی

تعلیمی سالِ نو بابت ۴۶-۱۴۴۵ھ کے لئے دار العلوم وقف دیوبند نے طے شدہ نظام العمل کے مطابق مؤرخہ ۱۰/رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ سے بذریعہ ویب سائٹ آن لائن تمام جماعتوں کے لئے درخواست برائے داخلہ کی تقسیم کا عمل شروع کر دیا تھا، جس کا سلسلہ مورخہ ۵/شوال تک جاری رہا۔ اس دوران طلبہ نے اپنے مقام پر رہتے ہوئے بسہولت درخواست فارم اور اجازت نامہ برائے شرکت امتحانِ داخلہ حاصل کئے اور امتحان کے مقررہ وقت پر ادارہ حاضر ہو کر شریک امتحان ہوئے۔ یہ طلبہ سفر کی صعوبتوں کے ساتھ داخلے کے متمنی طلبہ کے جم غفیر کی بنا پر ہونے والی مشقتوں سے بھی محفوظ رہے۔ وہیں ادارہ کو انتظامی امور کی انجام دہی میں سہولیات بھی میسر بھی آئیں۔ اس دورانیہ میں تقریباً گیارہ ہزار درخواست برائے داخلہ دفتر تعلیمات کو موصول ہوئیں۔ ابتدائی عربی و فارسی درجات نیز شعبہ تجوید میں داخلہ کے لئے ۶/شوال کو تقریری امتحان لیا گیا، جب کہ مورخہ ۸/تا ۱۰/شوال دو نشستوں میں امتحان سالانہ تحریری کا انعقاد عمل میں آیا۔ تقریباً ۱۳/شوال تک تمام جماعتوں کے لئے منتخب طلبہ کی فہرست جاری کر دی گئیں۔ بحمد اللہ امتحانات کے تمام مراحل طلبہ کی کثرت تعداد کے باوجود انتہائی منظّم و مرتب نظام العمل کے زیر اثر حسنِ انصرام کے ساتھ انجام پذیر ہوئے، جس کے لئے ادارہ کے نائب مہتمم محترم جناب مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب کی جملہ جہود و مساعی لائق تبریک ہے۔

تعلیمی سال نو کا آغاز

مؤرخہ ۲۵/اپریل ۲۰۲۴ء مطابق ۱۵/شوال المکرّم ۱۴۴۵ھ کو عظیم دینی درسگاہ دار العلوم وقف دیوبند میں جدید داخلوں کی کارروائی کو برق رفتاری سے انجام دے کر بخاری شریف کے افتتاحی درس کے ذریعہ نئے تعلیمی کا آغاز کر دیا گیا، بعد ازاں تمام درسگاہوں میں بھی باضابطہ درس کا آغاز ہو گیا۔ اس موقع پر دار العلوم وقف دیوبند کے روح رواں و مہتمم حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب مدظلہٗ نے فرمایا کہ امام

بخاری نے پہلی حدیث میں اس جانب اشارہ دیدیا کہ اعمال کا مدار آپ کی نیتوں پر ہے۔ لہٰذا اپنی نیتوں کو خالص کر لیجئے، محض رضائے الٰہی کی خاطر اپنے آپ کو حصول علوم نبویؐ میں مصروف کرلیں، اپنی زندگی سنت نبوی کے مطابق گذارنے کا عزم کریں، اسی میں دو جہاں کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ آپؐ کی سیرت میں تمام نظامہائے حیات موجود ہیں اور پھر جس کتاب کا آپ آغاز کر رہے ہیں اس میں وہ تمام احادیث جمع ہیں جن کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے بھی اجتماعی زندگی سے بھی، داخلی زندگی سے بھی ہے، خارجی زندگی سے بھی غرضیکہ اس میں تمام شعبہ ہائے حیات اور بین الاقوامی نظام زندگی موجود ہیں۔ آپ اس انداز میں پڑھیں کہ آپ کو امت کے ہر طبقہ کے قیادت کا فریضہ انجام دینا ہے۔ اس لئے آپ احادیث کی وسعتوں اور گہرائیوں میں غواصی کریں اور اپنے اساتذہ کی مدد سے ان قیمتی جواہر کو تلاش کریں جو مستقبل میں آپ کے لئے راہنما ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ بخاری شریف صرف ایک حدیث کی کتاب نہیں بلکہ علوم کا سمندر ہے۔ اس سمندر سے آپ کیا حاصل کرتے ہیں یہ آپ کی محنتوں، کاوشوں اور صلاحیتوں پر موقوف ہے۔ اس میں فقہی مسائل کا بیان بھی ہے اور موجودہ مشکلات کا حل بھی، آیات قرآنیہ کی تفاسیر بھی ہے اور سیر و مغازی کے واقعات بھی۔ سلوک و تصوف کا ذکر بھی ہے اور زبان و بیان کی چاشنی بھی۔ طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ حصول علم کے لئے آپ کا انتخاب منجانب اللہ ایک عظیم نعمت ہے جو کہ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ شکر کی متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے آپ کو منتخب فرمایا ہے اور اپنے اکابر و اسلاف کی علمی وراثت کی حفاظت کا فریضہ آپ کے ذمہ عائد کیا ہے۔ آپ اسلاف کے جانشین ہیں، اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خود کو سخت محنت کے لئے تیار کیجئے، تب ہی کامیابی آپ کے قدم چومے گی، لایعنی مشاغل، بے شعوری اور غفلت سے کلی اجتناب کرتے ہوئے آنے والے وقت کے لئے تیار ہوں۔ دین کے داعی اور اس کے پیغامبر بنیں، اپنے اندر اخلاص پیدا کریں اور ہمیشہ بارگاہ ایزدی میں علم نافع کے لئے دعاء کے خواستگار رہیں۔ جس علم کو حاصل کرنے آپ یہاں آئے ہیں یہ اکابر و اسلاف کی محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے اور ان کی شبانہ روز تگ و دو اور جد و جہد کے نتیجہ میں ہم تک یہ علم پہونچا ہے اور یہ آپ سے بھی محنت و جانفشانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں نیتوں کی اصلاح ضروری ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنی نیتوں کا جائزہ لیتے رہیں کہ کیا اب بھی آپ کی نیت اسی طرح خالص ہے یا اس میں کھوٹ پیدا ہو چکا ہے، ساتھ ہی ادارہ کے اصول وضوابط کا لحاظ رکھیں، حاضری اور اسباق کی پابندی کا خصوصی اہتمام کریں۔ مجلس کا اختتام حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب مدظلہٗ کی دعاء پر ہوا۔ اس موقع پر جملہ اساتذہ موجود رہے۔

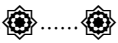

دارالعلوم وقف دیوبند کا تعاون کیسے کریں؟

بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ نے ادارہ کی ترقی کے لیے جو اصول وضع کئے ہیں ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ دارالعلوم کو توکل علی اللہ اور عوامی چندے سے چلایا جائے اور اس کے لیے خاص طور پر غریب طبقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے جو اہل خیر حضرات دارالعلوم وقف دیوبند کو اپنے عطیات، زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم ارسال کرنا چاہتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ:

اپنے حلقوں میں پہنچے ہوئے سفراء کرام (جن کے پاس دارالعلوم وقف دیوبند کا شناختی کارڈ ہو) کو رقومات دے کر رسید حاصل کرلیں۔ منی آرڈر، ڈرافٹ یا چیک کے ذریعہ اپنی رقومات براہ راست ارسال کرسکتے ہیں۔ وصولیابی کے بعد رسید ارسال کردی جائے گی۔ اگر براہ راست بینک اکاونٹ میں رقم جمع کرتے ہیں تو بذریعہ ای میل مطلع کردیں تاکہ اس کی تصدیق کرکے رسید ارسال کردی جائے۔

نوٹ: دارالعلوم وقف دیوبند کے چندہ دہندگان 80-G کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

تمام اکاؤنٹس کی تفصیلات

دارالعلوم وقف دیوبند کے کرنٹ اکاؤنٹس یونین بینک آف انڈیا، ایکسس بینک اور ایچ، ڈی، ایف، سی بینک میں ہیں، جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

UNION BANK OF INDIA		
(1) ACCOUNT TITLE	:	DARUL ULOOM WAQF
ACCOUNT NUMBER	:	372901010014039
BANK	:	UNION BANK OF INDIA (DEOBAND BR)
SWIFT CODE	:	UBININ BBMRT
IFSC CODE	:	537292
AXIS BANK		
(2) ACCOUNT TITLE	:	DARUL ULOOM WAQF
ACCOUNT NUMBER	:	915010029212886
BANK	:	AXIS BANK (DEOBAND BR)
SWIFT CODE	:	AXISINBB
IFSC CODE	:	UTIB0002426
HDFC BANK		
(3) ACCOUNT TITLE	:	DARUL ULOOM WAQF
ACCOUNT NUMBER	:	50200002786907
BANK	:	HDFC BANK (DEOBAND BR)
SWIFT CODE	:	HDFC INBB
IFSC CODE	:	HDFC0001974

Darul Uloom Waqf Deoband
247554 Distt. Saharanpur U.P. INDIA
Contact : 8439412767, 8439512767
Website:www.dud.edu.in

RNI UPURD/2010/32139
Postal Regd. No. RNP/SHN/005/2023-25

RNI UPURD/2010/32139
Published, Printed and Edited by Mohammad Sufyan Qasmi
on behalf of Darul Uloom Waqf Deoband
Near Eidgah, Moh. Khanqah, P/o Deoband, Distt. Saharanpur (U.P.) &
Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers,
Moh. Barziyaul Haq, Deoband (U.P.)

Vol: 15
Issue: 11
Shawwal-Dhul Qada 1445
Apr-May 2024

دارالعلوم وقف دیوبند کے چندہ دہندگان ۸۰ جی کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ

आयकर अधिनियम की धारा 80 जी के आधीन कर मुक्त प्रमाण पत्र
न. सी. न. (238)/कर मुक्ति/ आ. आ. मु. नगर/आ. आधि (तफ)/2009–10/9603

Exempted u/s 80G
No (238)/TAX EXEMPT/CIT MZN/I.T.O. (TEC) 2009-10/9603